
بعونہ

لکھنؤ کے مشہور شاعر مرثیہ گو جناب پیارے صاحب رشید کے حالات زندگی

مع تصویر

المسمیٰ بہ

حضرت رشید

۱۹ ۴ ۲۲

مع

انتخابات مراثی و رباعیات و قصائد و سلام و غزل وغیرہا

مؤلفہ

سید آغا اشہر لکھنوی

اصح المطابع چھوٹی ٹولہ لکھنؤ

باہتمام محمد قادر بخش مالک مطبع ہذا

محمد علی رامپوری

بعونہ

یہ

تالیف حقیر

محسن رشید

قدردانِ اہلِ سخن عالیجناب معلی القاب نواب

بہرام الدولہ بہادر رئیس اعظم حیدرآباد دکن

کے

[illegible] سے معنون کی جاتی ہے تاکہ

باعثِ افتخار ہو

حقیر

مؤلف

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضِ مؤلف کسی فردِ کامل کے واقعاتِ زندگی کو جمع کر کے عوام کے سامنے پیش کرنا میری رائے میں ایک اجرِ معقول رکھتا ہے جس کا معاوضہ اگر غور سے دیکھا جائے تو ناممکن ہے۔ یہ ایک ایسا احسان ہے جو اُس اہلِ فن پر ہوتا ہے جس سے اُس فرد کو تعلق ہو۔ مثلاً اگر کسی فاضل کے حالاتِ زندگی لکھے جائیں تو پڑھنے والے کو جابجا دلچسپ باتیں علم و فضل کے متعلق ملیں گی۔ اُس وقت کے فلسفہ۔ منطق۔ ریاضی۔ ادب۔ فقہ وغیرہ کے بہتر سے بہتر جاننے والے اُس ایک فرد کی وجہ سے صفحاتِ تالیف میں نمایاں نظر آئیں گے۔ اُس خاص دور کے لوگوں کا کسی خاص صنفِ علم کی طرف انہماک کا اظہار ہو جائے گا۔ اُس صنف کی تصنیفات و تالیفات کے متعلق پڑھنے والے کو اطلاع ہو جائے گی۔ حاکمِ وقت کی روشِ حکومت۔ اور اُس کے زمانہ میں جو کوششیں علوم و فنون کے برقرار رکھنے میں کی گئی ہونگی معلوم ہو جائیں گی اور پڑھنے والے سے داد طلب ہونگی۔

المختصر اگر کسی مشہور فرد کے حالاتِ زندگی اچھی طرح مرتب ہو جائیں تو پڑھنے والا ایک

اُس کے عادات و اطوار و اخلاق و علم کا اثر ضرور پڑے گا۔ اور بعض اُس کی پیروی کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ معلوم ہوا کہ اس قسم کی سوانح عمریاں آئندہ نسلوں کے لیے ایک قسم کی درسی کتابیں ہیں۔ خصوصاً کسی زبان کے زبردست ادیب کے حالاتِ زندگی از اول تا آخر خود ادب ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ ہر شخص کو اپنے علم ادب سے جس قدر دلچسپی ہوتی ہے اتنی اُس کے غیر سے ہرگز نہیں ہوتی۔ اس علمِ ادب میں وہ تمام باتیں مجموعۃً ملتی ہیں جو علیحدہ علیحدہ علوم میں نظر آتی ہیں +

یورپ آج کل زبان زبان پکار رہا ہے۔ اشاعتوں کی کوئی انتہا نہیں۔ دُنیا کے چاروں کونے مغربی زبان کی تصنیفات و تالیفات سے مملو نظر آتے ہیں۔ انسانی تمدن میں اصلاحات کے پردہ میں تغیر و تبدل ہو رہا ہے۔ روش سلطنت اور ہی رُخ جاتی ہے +

خصوصاً ہندوستان میں انگریزی علمِ ادب کو تو اس قدر توسیع ہوئی ہے کہ اُس کے ادیبوں کے بیشتر نام وہ لوگ بھی جانتے ہیں جو اس زبان سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ انگلینڈ کا کیا ذکر۔ ہندوستان کا ہر پڑھا لکھا آدمی میر، غالب، انیس کو ہرگز نہیں جانتا۔ مگر انگلینڈ میں پیدا ہونے والا ہومر، شیکسپیر، ملٹن کو ضرور جانتا ہے اور فخر کرتا ہے کہ اُس کی قوم میں ایسے جوہرِ قابل پیدا ہوئے ہیں +

کاش ہم کو بھی زمانہ فرصت دے اور اس قابل بنائے کہ ہم بھی اپنی ملکی زبان کے برقرار رکھنے میں ہم آواز ہوں! +

شاعری اور مرثیہ — زمانۂ خلیق تک فن مرثیہ گوئی محدود تھا۔ خلیق نے اُس پر کچھ اضافہ کر کے آگے بڑھایا۔ انیس و دبیر ایسے کامل افراد نے اس آرٹ ترقی اور وکو اس قدر توسیع دی کہ اگر آنے والی نسلیں اُس کا صحیح استعمال بے کم و کاست کرتی رہیں تو سب کوششیں

ترقی اُردو کی ایک طرف اور مرثیہ گوئی ایک طرف۔ جب غور کیجیے گا اس صنفِ سخن کو مفید پائیے گا۔ اس سے قطع نظر کرکے کہ عام اہلِ اسلام کے لیے عموماً۔ اور شیعہ حضرات کے لیے خصوصاً مرثیہ کا ایک حصّہ (اصل واقعاتِ کربلا) مذہبی دلچسپی رکھتا ہے۔ مگر اس کے علاوہ اُس کے دوسرے اجزا مثلاً بیانِ شجاعت، بیانِ عفت، بیانِ سخاوت، بیانِ عدالت یا وہ اوصاف جو ان کے تحت میں آتے ہیں۔ مثلاً ایثار نفس، صبر وغیرہ عام انسان کے لیے متحد ہیں اور سب کے جذباتِ اضطراری سے دائمی تعلق رکھتے ہیں۔ لہذا دُنیا کے ہر مذہب کے افراد کے لیے مرثیہ میں یکساں دلچسپی کے سامان موجود ہیں۔

یہی سب باتیں تھیں جنھوں نے مجھ کو رشید کے حالاتِ زندگی لکھنے پر آمادہ کیا کہ آخر میں نے اُسے ختم ہی کرکے چھوڑا الحمدُ لِلّٰہِ وَالمِنّۃ۔

دُنیا میں یوں تو ہر شخص تعلقات اور مجبوریوں کا بندہ ہے۔ دوسرے انسان کو زمانہ کسی خاص مصروفیت کے لیے بہت کم وقت دیتا ہے۔ لیکن باوجود اس کے اگر ایک خود ساز طالب علم جس کو کتاب سے دائمی تعلق ہوگیا ہو، اپنے مصروف اوقات کا کچھ حصّہ ادبی خدمت میں صرف کرے تو اُس کی زندگی کے وہ لمحے دلچسپی کی نظر سے دیکھے جانے کے قابل ہیں +

جنابِ رشید مرحوم مجھ پر بہت عنایت فرماتے تھے اور مجھ کو بھی اُن سے ایک خاص اُنس تھا۔ ایک مرتبہ شاید ۱۹۱۱ء میں میں نے عرض کی: "آپ اپنے کچھ حالات قلمبند کرا دیجیے، تاکہ آپ کے بعد اُردو بولنے والوں کے سامنے پیش کرکے اُن کو آپ کی ادبی خدمتوں کا معترف کیا جائے"۔ جواب ملا "کیا ضرورت ہے"۔ دوسری مرتبہ میں نے اس کا ذکر جناب سیّد باقر صاحب حمیؔد مرحوم سے کیا۔ اُنھوں نے فرمایا۔ "جناب مولوی سید محمد نقی صاحب شاؔداں لکھنوی سکنڈ پروفیسر مدرسہ عالیہ ریاست رامپور نے

خود جنابِ رشید سے اُن کے حالات قلمبند کیے ہیں۔ اور کچھ مرتب بھی کر چکے ہیں"
اب مجھ کو اس کے متعلق مزید سوال کی گنجائش نہ رہی۔ بلکہ یہ سُن کر مسرت ہوئی کہ رشید کے
حالات ایک سنجیدہ قلم سے شائع ہونگے۔

جنابِ رشید کے انتقال کے بعد ایک روز پھر میں نے جناب حمید مرحوم
سے عرض کی "ابھی تک کوئی تالیف رشید کے متعلق شائع نہیں ہوئی" مرحوم نے
فرمایا "نا اُمیدی ہے" میں نے عرض کی "اگر میں کوشش کروں تو آپ مدد دینگے" فرمایا "
بسر و چشم۔ لیکن اگر مولوی محمد نقی صاحب شادماں سے وہ نامکمل حالات مل سکیں
جو اُنھوں نے اس غرض سے فراہم کیے ہیں تو زیادہ بہتر ہوگا" میں نے کہا "بہت خوب"
چنانچہ ۱۹۱۶ء میں صرف اس غرض سے میں رامپور گیا۔ اور مولوی صاحب موصوف سے
خواہش کی کہ وہ مجھے حالات جنابِ رشید دے دیں۔ اُنھوں نے مجھ کو اپنا نیازمندِ
قدیم سمجھ کے وہ تمام ذخیرہ جو اُن کے پاس موجود تھا۔ میرے حوالہ کیا۔ جو اس تالیف کے
مندرجہ ذیل حصوں پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔

(۱) جناب اُنس کے حالات قریب قریب مرتب۔

(۲) رشید کے حالات غیر مرتب (یعنی صرف اُن کے مرثیہ پڑھنے کے مقامات کا مختصر حال۔
باقی تمام حالات ضروری بڑی کوشش سے خود فراہم کیے جو اس ترتیبی صورت میں موقر
ناظرین کے سامنے پیشکش ہیں۔

جنابِ رشید کے حالاتِ زندگی اس سے زیادہ ہو بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ مرحوم
نے اپنی تمام عمر گوشۂ عافیت میں گذار دی۔ دوسرے مرثیہ گوئی کا اہم کام اُن کے واسطے
ایسا تھا کہ اُن کو کنج عزلت سے نکلنے ہی نہ دیتا تھا۔

میں جناب مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی۔ اور جناب مرزا کاظم حسین صاحب محشر کا ممنون ہوں۔ ان دونوں حضرات نے مجھ کو مختلف واقعات رشید دیے۔ اور وقتاً فوقتاً میری ہمت افزائی کرتے رہے تاکہ میں جلد سے جلد اس تالیف کو ختم کروں۔ جناب نواب مجن صاحب جویاؔ۔ اور جناب بدھن صاحب فرہاؔد لکھنوی کا ممنون ہوں ان حضرات نے مجھ کو فراہمی کلام رشید میں مدد دی ہے۔ جناب مولوی سید محمد حسن صاحب ہاتفؔ وکیل۔ اور جناب منشی علی محمد صاحب نظمؔ سیتاپوری کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اول الذکر کے مشورہ ہائے صائب سے مستفید ہوا ہوں۔ اور آخر الذکر کے ذخیرۂ کتب سے اکثر مدد ملی ہے۔ آخر میں معظمی جناب سید اولاد حسین صاحب شاداں بلگرامی پروفیسر مدرسۂ عالیہ ریاست رامپور کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ موصوف نے اس مسودہ کو سُن کے میری عزت افزائی کی ہے۔ اور بیش بہا مشورے دیے ہیں۔

ناظرین کی خدمت میں ایک مختصر عرض اور کرنا چاہتا ہوں۔ اور عبارت کو ختم کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ علاوہ اصل واقعات کے اگر کوئی رائے غیر صائب ہو۔ یا کوئی بحث کسی صاحب کو پسند نہ آئے تو وہ میرے قلم کی کوتاہی ہے جس کا میں ہر وقت معترف ہوں اور رہوں گا۔

احقر

سید آغا اشہر لکھنوی

شاعری و تاریخ

ارسطو کہتا ہی "شاعری انسانی بلند خیالی کے اظہار کا ایک عمدہ آلہ ہی" اسلاف کے کارنامے اور گذشتہ صدیوں کی تاریخیں سوائے اس کے کچھ نہیں کہ دُنیوی حیثیت سے مختلف افراد کے زوال و عروج کی تصویریں پیش کریں اور تہذیب و تمدن کے مدارج و ترقی کو زمانہ کی روش کے مطابق دکھائیں کیونکہ تاریخ کو صحتِ واقعات سے تعلق ہی اور شاعری کو نیرنگیٔ خیال سے۔

تاریخ کی غرضِ حقیقی یہ ہی کہ ہر موجودہ صدی کے افراد گذشتہ واقعات کا تطابق اپنے زمانہ سے کریں اور اپنے تجربے فرضِ عین سمجھ کر آنے والی صدیوں تک پہنچائیں۔

برخلاف اس کے شاعری اُن معاملاتِ انسانی کو پیش کرنے کے پیچھے نہیں جو عمل میں آچکے ہوں (تاریخی نظمیں اس بحث سے خارج ہیں۔ کیونکہ وہ شاعری کی اصل منشا کو پورا نہیں کرتیں) یا جن پر اصولِ فطرت کے مطابق معرضِ وجود میں آنے کا احتمال ہو بلکہ تصور کی پیدا کی ہوئی وہ تصویر جس کو صرف رُوحِ انسانی ہی محسوس کر سکتی ہو اور جو کسی جامۂ ظاہری کی محتاج نہ ہو اس اعجاز نما فن کے ذریعہ سے ایسی ہی نمایاں صورت میں پیش ہو سکتی ہی جس طرح ایک صحیح قلم مصور کسی جادو نگار مرقع کو صفحۂ کاغذ پر دکھاتا ہی +

تصویرِ خیال و تصویرِ قلم

قوتِ تصور کی پیش کردہ تصویر کے متعلق میں اپنی مستقل آواز میں یہ کہنے کو تیار ہوں کہ فطرت نے اُس میں وہ دلچسپیاں ودیعت رکھی ہیں جس کا دسواں حصہ بھی کاغذی تصویر کو میسر نہیں آسکتا۔ وجہ یہ ہی کہ موخر الذکر (یعنی کاغذی تصویر) مشاہدہ کرنے والے کے جذبۂ اشتیاق کو ایک حد تک مطمئن کر سکتی ہی۔ مگر چونکہ شعر کا اُڑتا ہوا نقشہ کوئی مستقل حدِ تکمیل نہیں رکھتا۔ بلکہ ہر غور کرنے والے کے احساساتِ خیالی یا جذباتِ اضطراری کی رسائی کی مناسبت سے اُس میں تغیر و تبدل کے رنگ چڑھتے اُترتے ہیں

اس بنا پر باطنی نظارہ کرنے والا کبھی مطمئن نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اُس کا اشتیاق اپنے مطمح نظر صورت کی تلاش میں کوئی مستقل حد قائم نہیں کر سکتا بلکہ ہر لحظہ بڑھتا ہی جاتا ہی۔ ہاں اگر خیال اور اضطرار کی کوئی حد معین ہوتی تو میں ہرگز یہ نہیں کہہ سکتا کہ تصویر قلم سے زیادہ تصویر خیال دلچسپ ہی۔

یہ مسلّم ہی کہ شاعری اور مصوّری ایک ہی درخت (خیال) کی دو بار آور شاخیں ہیں لیکن شاخ مصوّری شاعری کی گھنی شاخ کے سایہ میں جھونکے لے لے کے دلفریبیاں دکھاتی ہی کیونکہ مصوّر بھی پہلے شاعرانہ قوت سے کام لیتا ہی اُس کے بعد اندازہ سے اور پھر قلم سے اس وقت آپ کے سامنے میں نے دو تصویریں پیش کیں۔

۱۔ تصویرِ قلم ۲۔ تصویر خیال

تصویر قلم کی تکمیل کے لیے ان چیزوں کی سخت ضرورت ہی۔

۱۔ مصوّر کا صحیح اندازہ۔ ۲۔ حسب منشا قلم پر قدرت۔

۳۔ مناسبت اجزائے تصویر۔ ۴۔ سامان۔ رنگ وغیرہ۔

وہی قلم کار کامیاب سمجھا جاتا ہی جس کو یہ سب آسانیاں نصیب ہوں۔ ایسی خوش قسمت کے بنائے ہوئے نمونے اس نظر خوش کن تجارت کے بازار کو گرم رکھتے ہیں۔ گو اُس سے کم مرتبہ والے بھی ہمیشہ شہرت کے زینہ پر اُس کے برابر آنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن جہاں فطرت کا دخل ہوتا ہی وہاں کوشش وکسب بے سود۔

افسوس ہی کہ اس فن کی قدر ہندوستان میں ابھی بالکل نہیں ورنہ اس کی ترقی کے ساتھ شاعرانہ ترقی بھی جاری رہتی۔

اسی طرح ایک تصویر خیالی کے لیے مندرجہ ذیل چیزوں کی ضرورت ہی جن کا مل

علیحدہ علیحدہ ایک دوسرے کی تکمیل کرتا ہی۔ یعنی

۱۔ صحتِ خیال ۔۔۔ ۲۔ قدرتِ اظہار

۳۔ مناسبتِ الفاظ ۔۔۔ ۴۔ اطلاعِ فن

یہ سب خوبیاں اگر کسی شاعر میں پائی جائیں تو بے شک وہ اک فطرتی شاعر ہی۔ مگر تجربہ یہ کہتا ہی کہ اس معدوم ہو جانے والے گروہ کے آخری دور تک ایسے کاملین کے کم نام جمع ہو سکیں گے۔

صحتِ خیال | یہی صحتِ خیال بعض اوقات شاعر کو اُن امور کا پتہ دیتی ہی جو عالمِ وجود میں ابھی نہ آئے ہوں۔ یہی قوتِ شاعر اور پیشین گو کو ایک ہی درجہ پر لے آتی ہی۔ شاعر کا ذریعۂ اطلاع اُس کا ذہنِ رسا، اور فکرِ صائب ہی۔ برخلاف اس کے ایک پیشین گو کا ذریعۂ اطلاع اس کا تزکیۂ نفس، اور صفائیٔ باطن ہوتی ہی۔ اور دونوں میں یہی فرق ہی جس کی وجہ سے ایک ایسے شاعر کو جو قوتِ استنباط رکھتا ہو دنیا دوسری نظر سے دیکھتی ہی۔ اور ایک پیشین گو کو دوسری نظر سے۔ اس موقع پر بے اختیار غالبؔ کا یہ شعر یاد آگیا ؎

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالبؔ ۔۔۔ تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

اگرچہ بظاہر ان دونوں کا میدانِ عمل ایک دوسرے سے جدا نظر آتا ہی۔ مگر غرض دونوں کی خلق کی ایک ہی ہی۔ شاہ نعمت اللہ کے قصائد کی نسبت مشہور ہی کہ ان میں تمام آئندہ کے حالات بالاجمال لکھ دیے گئے ہیں۔ اب آپ کی پسند پر ہی چاہیے انھیں پیشین گو کا لقب دیجیے یا شاعر کا۔

قوتِ اظہار | صحتِ خیال کے بعد قوتِ اظہار کی باری آتی ہی۔ یہ قوت بھی شاعر کے لیے ایسی ہی ضروری ہی۔ جیسے مذکورۂ بالا قوت یعنی (صحتِ خیال) اس کے بغیر شاعر کا کوئی خیال صحیح عالمِ وجود میں نہیں آسکتا۔ اُس کی تمام فکریں رائگاں، اُس کے تمام منصوبے

بے سُود۔ مگر یہ قوت نہیں تو کچھ نہیں۔ لیکن جہاں یہ قوتیں برابر برابر کام کرتی ہیں وہاں خدا کی قدرت نظر آتی ہے۔ اور اِن کا رکھنے والا جس وقیع نام سے پکارا جائے زیبا ہے۔

متقدمین شعرائے عجم میں **فردوسی**، اور متاخرین میں **قاآنی** ہے۔ اُردو میں **سودا اور انیس** ہیں۔ جن میں **قوتِ اظہار**، بہ کمال پائی جاتی ہے۔ اگرچہ دوسرے نام بھی اسی سلسلہ میں لکھے جا سکتے ہیں۔ مگر یہاں اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ ہر ناظر کو اختیار ہے کہ اپنی رائے کے موافق دوسرے نام بڑھا لے۔

مناسبت الفاظ اظہارِ خیالات و جذبات کا قدرتی آلہ جو انسان کو فطرت کی طرف سے عطا ہوا ہے، وہ اُس کی مادری زبان ہے۔ جس قدر ہم اپنی زبان کے اصطلاحات و محاورات پر قادر ہونگے۔ اسی قدر ہماری شاعرانہ خوبیوں کو اظہار کا موقع ملے گا۔ یا یہ کہنا درست ہوگا کہ جس کو جس قدر ملکہ اس خزانہ کے صرف کرنے کا حاصل ہوگا۔ اُسی قدر اُس کی خیالی تصویر جواہر نگار نظر آئے گی۔

اسی **مناسبت الفاظ** کو زمانہ مرصع کاری کہتا ہے۔ اسی کو ملمع کاری۔ یہی سخن طرازی ہے۔ یہی دل آویزی۔ خلاصہ یہ کہ یہی سب کچھ ہے

اس قوت کے جوہر اُسی وقت کھلتے ہیں۔ جب کسی مقرر کو دیر تک ایک گوش بر آواز مجمع کو مخاطب کرنا ہو۔ کسی مضمون کو مختلف نحوں سے سمجھانا ہو۔ یا اُن کے جذباتِ طرب یا جذباتِ الم کو برانگیختہ کرنا ہو۔ یا کسی واقعہ کو مسلسل بیان کرنا ہو۔ تو بغیر مناسبت الفاظ سامعین خاطر خواہ متوجہ نہیں رہ سکتے۔ اسی طرح ایک مصنف یا مؤلف کو جب تک مناسب تحریر کی قدرت نہو، اُس وقت تک صرف کاغذ کا سیاہ کرنا ہے۔

ایک معنوی شاعر کی شناخت یہ ہے۔ کہ اُس کی نظم میں خیالات و مناسبات الفاظ

دست و گریبان نظر آئیں۔ وہی شعر سہل ممتنع کہے جانے کے قابل ہے۔ جس میں صحت خیال کی خوبی اپنی حد تک پہنچ چکی ہو۔ اور مناسبت الفاظ کی کسوٹی پر کس لیا گیا ہو۔

یہی صفت شاعر کو پختہ کار بناتی ہے۔ یہی قادر الکلام کہلواتی ہے۔ یہی فردوسی کو فردوسی قاآنی کو قاآنی۔ سودا کو سودا۔ اور انیس کو انیس منواتی ہے۔

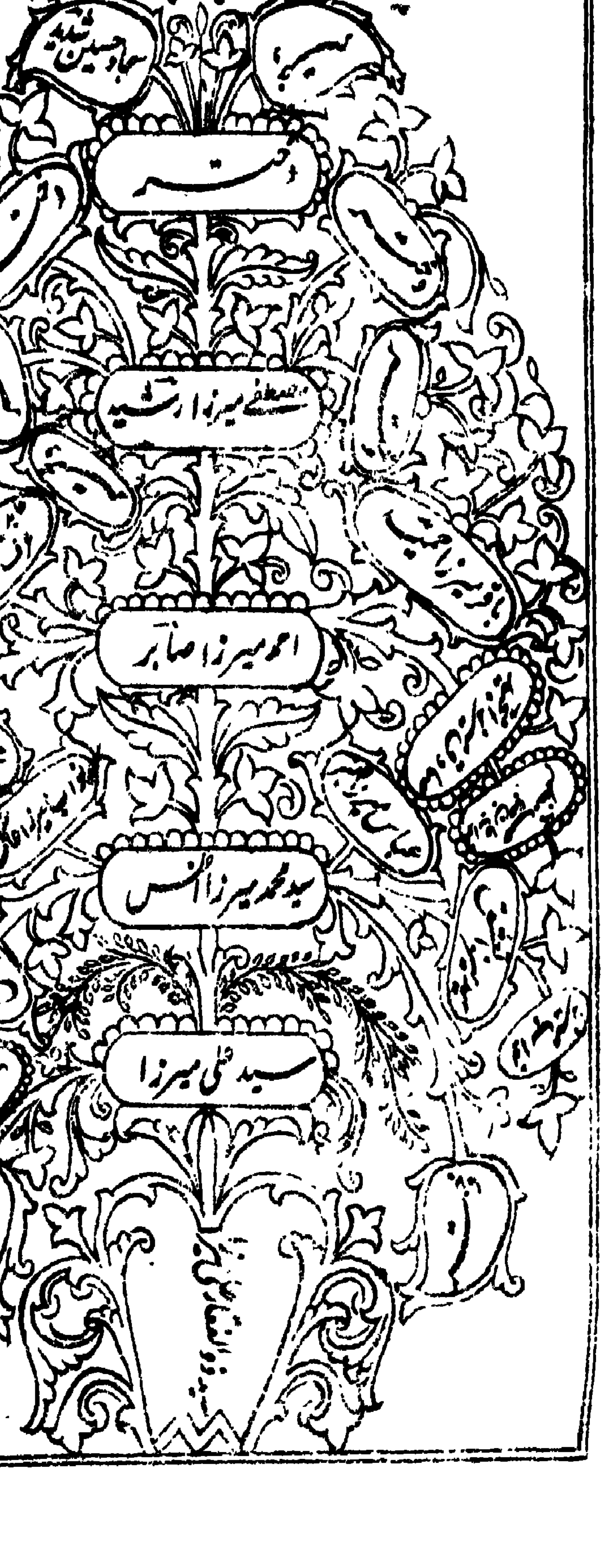
کسی واقعے یا مضمون کو نظم کر دینا کوئی مشکل امر نہیں۔ مگر اُس کو دلچسپ بنانا مشکل ہے ہزاروں شاعر پیدا ہوتے ہیں۔ مگر ایک صدی دوسری صدی کو جو شعرا کی فہرست دیتی ہے اُس میں مشکل سے چار یا پانچ نام ہوتے ہیں۔ اور بس۔

اس وقت اُردو شاعری کا سفینہ کھینے والے ہندوستان میں ہر طرف نظر آتے ہیں مگر زمانہ کی بے رُخ لہر خود اُنھیں کو ادھر سے اُدھر تھپیڑے دیتی ہے کہ سنبھلنا مشکل ہے ساحل مراد پر پہنچنے کا کیا ذکر۔ بہر حال یہ بھی ایک قسم کا احسان ہے جس سے جس طرح بن پڑے کوشش کرے۔ کسی وقت تو کامیابی کی دیر نما صورت نظر آئے گی۔

اطلاع فن | اطلاع فن کے متعلق یہ عرض ہے کہ سب سے پہلی ضروری چیز بھی ہے۔ اور سب سے آخر بھی۔ اور نہیں بھی۔ مگر شاعر کو نہایت ضروری ہے کہ مشق سخن سے پہلے فن شعر کے ابتدائی مسائل سے واقفیت حاصل کرلے۔ ورنہ بغیر اس کے خود اُس کی طبیعت کا اطمینان کبھی نصیب نہیں ہو سکتا۔ ذوق و ناسخ کی طرح نہ سہی تو انیس و آتش ہی کی طرح سہی۔ گو چودھویں صدی کی شاعرانہ طوائف الملوکی نے فن کا سد باب کر دیا ہے۔ مگر جو خال خال افراد واقف فن اس وقت نظر آتے ہیں ان کے بعد اتنے بھی نہ ہونگے۔

بس میرا تنگ میدان قلم جو لکھنا تھا لکھ چکا۔ اب یہ آخری صدا دے کے ختم کرتا ہے کہ "اے نوجوانو! ہند کی خاک کو کیمیا بناؤ۔ اور اپنی مادری زبان کو سنوارو۔"

سلسلۂ جناب رشید مرحوم



سید ذوالفقار علی میرزا

یہ بزرگ غالباً زمانہ محمد شاہ میں کشمیر سے دہلی آئے۔ اور کسی وزیر کے نائب ہوئے اور خطاب میرزا حاصل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی اولاد و احفاد کے نام کے ساتھ لفظ میرزا ضرور ہوتی ہے۔ بعد اس کے سید ذوالفقار علی میرزا دہلی سے لکھنؤ آئے اور یہاں آکر سکونت اختیار کی

لفظ میرزا کی تحقیق

اس لفظ کے متعلق جہاں تک تحقیق ہوئی اُس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ لفظ میرزا کا جزو نام ہونا علامت سیادت کی نہیں۔ اگرچہ ایران میں یہ لفظ اطلاق سیادت کرتی ہے۔ مگر ہندوستان میں اس خصوصیت کے لیے مروج نہیں۔ چنانچہ صاحب بہار عجم لکھتے ہیں

"میرزا بیائے معروف ایں لفظ بیشتر از القاب پادشاہاں وشاہزادگان بود۔ دریں روزگار بر بزرگ زادگاں و رئیس پسراں اطلاق کنند۔ در ایران بر سادات نیز مجوز است۔ غالباً میر مخفف امیر است۔ پس معنی ترکیبی میرزا) امیر زادہ باشد۔ از زمانے کہ نادر شاہ در ہندوستان در آمد و در قبض و تصرف آورد۔ اطلاق میرزایاں بر محرران دفتر شاہی کنند کہ میرزائے دفتر عبارت از نویسندہ دفتر خانہ پادشاہی ست"

مؤلف کے نزدیک چونکہ میر اصطلاحاً بمعنی سردار ہے جیسے میر آتش، میر سامان، میر بحر وغیرہ اسی طرح میرزا سے ملازمین دفتر شاہی کی گونہ عظمت ظاہر ہوتی ہے۔

بہر حال سید ذوالفقار علی میرزا مع اپنے فرزند سید علی میرزا صاحب کے لکھنؤ آکر مقیم ہوئے۔ ان بزرگ نے دہلی کیوں ترک کی۔ اور لکھنؤ کیوں آئے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ کہ زوال سلطنتِ مُغلیہ کے ہمراہ اہلِ قلم کا ستارہ بھی پستی کی طرف مائل ہونے لگا زمانہ نے ایسے ایسے نازک مزاج اور مستغنی دلوں کو حوادث کا نشانہ بنایا جو کبھی سوائے آسمان کے

رہن کی طرف دیکھتے ہی نہ تھے۔ کونسی مثال دی جائے۔ کس کا نام لکھا جائے۔ اُس وقت کے ناموروں کے تذکروں کا ہر ہر ورق ایک نئی مثال پیش کرنے کو تیار ہے بہت ٹھیک خیال ہے کہ دہلی اُجڑی۔ اور لکھنؤ آباد ہوا۔

امرائے لکھنؤ کی اولوالعزمیاں حد اعتدال سے متجاوز ہو چکی تھیں۔ دہلی کے ضعف کا کوئی خاص اثر لکھنؤ پر نہ تھا۔ علوم قدیمہ کا وقار دلوں میں باقی تھا۔ خصوصاً فنِ شعر جس کا عالمگیر اثر اس ناداری کے زمانہ میں بھی بہت سے دلوں پر قادر رہا۔ اُس وقت کے رؤسا کے درباروں کا ایک گلدستۂ زینت تھا۔ جس نے دہلی کو الوداع کہا وہ لکھنؤ یا حیدرآباد جا بسا +

افسوس ہے کہ میر صاحب کے مزید حالات نہ مل سکے۔ جو درج کیے جاتے۔ خود جنابِ رشید مرحوم سے جیسا معلوم ہو سکا تھا۔ وہ لکھا گیا۔ کیونکہ کسی تاریخ کی کتاب میں اُن کے خاندان اور کسب معاش کے متعلق کچھ نہ ملا + البتہ آغا میر کا ذکر ملتا ہے۔ صاحب تاریخ اودھ عبارتِ ذیل لکھتے ہیں جس سے عالی نسبی اور سیادت کی شہادت ملتی ہے:

"از آں جملہ نواب معتمد الدولہ آغا میر کی علوئے نسب پدری و شرافت و سیادت۔ و حسن لیاقت۔ اور مروت خاص۔ اور سیر چشمی و رفقاپروری بہت غنیمت تھی!"

(معتمد الدولہ آغا میر سید ذوالفقار علی کے بھتیجے تھے)

سید علی میرزا

یہ ذوالفقار علی میرزا کے فرزند تھے۔ شاہِ اودھ (غازی الدین حیدر) کے زمانہ میں کارسفارت انجام دیتے تھے۔ بنارس میں ان کا زیادہ قیام رہتا تھا۔ نہایت خوب صورت اور وجیہہ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جب بنارس میں نکلتے تھے۔ تو لوگ اُن کی صورت دیکھکر درود پڑھتے تھے۔ لکھنؤ میں جس قدر منڈیاں تھیں۔ اُن کی تحصیل وصول بھی انھیں کے متعلق تھی۔ معتمدالدولہ آغا میر مشہور وزیر اودھ ان کے چچازاد بھائی تھے۔ بھائیوں میں چشمک رہتی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب آغا میر کو عروجِ تام حاصل ہوا۔ ان کی تنخواہ بند کرادی۔ شاہ میناصاحب کے وہاں ایک محلہ میں رہتے تھے۔ تخمیناً ستر برس کی عمر ہوئی۔ اور غالباً حسن رضا خاں کے امام باڑہ میں مدفون ہیں۔

سید صاحب کے دو بیٹے تھے۔ سید محمد میرزا اُنس۔ سید محمد رضا قدس۔

علی میرزا صاحب مغفور کو خطِ نسخ میں یدِطولےٰ حاصل تھا۔ اور اُس وقت کے بہتر نسخ لکھنے والوں میں شمار ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ پورا سورۂ یٰس لکھ کر حضورِ شاہی میں پیش کیا تھا۔ جس کا خاطر خواہ صلہ ملا۔ رشید مرحوم کے پاس اُن کے ہاتھ کا لکھا ہوا پورا قرآن شریف موجود تھا +

سیّد محمد میرزا صاحب اُنس

سیّد ذوالفقار علی کے پوتے۔ اور جناب رشید کے دادا تھے۔ ان کا تخلص (اُنس) تھا۔ حضرتِ ناسخ مرحوم کے شاگرد تھے۔ اس خاندان میں انھیں سے شاعری کی ابتدا ہوتی ہے۔ تعجب یہ ہے کہ تذکرۂ آبِ حیات میں آزاد مرحوم نے شیخ ناسخ کے نامی شاگردوں کی فہرست میں ان کا نام نہیں لکھا۔ ظاہرا وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اُن کا دیوان شائع نہیں ہوا۔ دوسرے آزاد مرحوم نے شاگردانِ ناسخ کے لیے زیادہ کاوش بھی نہیں کی ہے۔ البتہ عبدالغفور خاں نسّاخ نے اپنے تذکرۂ سلسلۂ ناسخ میں اُنس کا ذکر کیا ہے۔

جنابِ اُنس ذی علم بزرگ تھے۔ عربی کے تمام درسیات نکلے ہوئے تھے۔ اور فارسی میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ شعر بھی اچھا کہتے تھے۔ دیوان قلمی اس وقت تک خاندانِ رشید میں موجود ہے۔ جنابِ رشید سے جب کہا گیا "وہ دیوان طبع کرا دیجیے" فرمایا "اُن کی وصیت تھی کہ چھپوانا نہیں"

حلیہ و لباس گورا رنگ تھا۔ نہایت خوب صورت تھے۔ جوانی میں ورزش کا بہت شوق تھا۔ کیادہ (جو مثل کمان کے ہوتا ہے) کھینچتے تھے۔ اونچی چولی کا انگرکھا پہنتے تھے۔ اور جس وقت دربار میں جاتے تھے تو چکن استعمال کرتے تھے۔ کرتہ بہت نیچا ہوتا تھا کبھی مشروع کا پاجامہ پہنتے تھے۔ اور کبھی سادہ۔ ٹوپی پچگوشیہ قالب دار۔ جوتہ گھیتلا وہی ایک اشرفی کا۔ مگر کبھی کبھی بوٹ بھی۔

پرانی سکونت شاہی زمانہ میں بہت سے محلوں میں رہے۔ مثلاً ٹکسال، گنج، رشیدیوں والا احاطہ غدر کے بعد حسن خاں خواص واجد علی شاہ کا مکان ایک ہزار ایک سو روپیہ کو خرید کیا

اُس کے برابر ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا وہ بھی خریدا۔ اس میں متعدد چھوٹے چھوٹے مکان لے کر ملائے جو اب تک "میر عشق کی بغیہ" کے نام سے موسوم ہے۔ مگر میر صاحب کے زمانہ میں "باغِ اُنس" کہلاتا تھا +

میر صاحب نے چاہا تھا کہ اس باغ کے متصل ایک امام باڑہ بنائیں لیکن ایک پھاٹک اور اُس کے اِدھر اُدھر دو کمرے بن کر رہ گئے۔ جو اب تک موجود ہیں۔ اس امام باڑہ کے مقدس تہہ خانہ میں سبزہ زار نظم کے چند جادو بیان بُلبل خواب گراں میں مصروف ہیں اب وہ وقت ہے کہ خود اُنھیں کے ہاتھوں کے پرورش یافتہ درختوں کے پھول نسیم سحر کو اپنی مہک سے عطر بیز کرتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ کبھی پھر ہماری طرف توجہ کریں۔ مگر وہ سرو جھونکے اُن کے خواب کی مدت اور طولانی کرتے ہوئے اور یہ شعر پڑھتے ہوئے اپنی ہیں

یہ سناٹا یہ تاریکی یہ گورستاں یہ ویرانی   نہیں اے سونے والو کس طرح آرام آتا ہے

یہاں اُنس، صابر، تعشق، عاشق، جدید کی قبریں ہیں۔ (میر عشق کی قبر اس میں نہیں ہے بلکہ اُس مکان میں ہے جہاں رشید مرحوم رہتے تھے۔ وہ مکان بھی باغ سے متصل ہے +

اُنس اور شاعری | اُن کی غزل خوانی کا بہت شہرہ تھا۔ سراج الدولہ۔ اسیر وغیرہم کے مشاعروں میں اکثر شریک ہوتے تھے۔ اور مشاعرے کو اپنا ثنا خواں بنا کے اُٹھتے تھے۔ آخر وقت میں جب نواب مہدی حسن خاں عرف آغا ابو صاحب سی۔ آئی۔ ای متولی حسین آباد مبارک کا شباب تھا۔ تو اُن کو بھی بمقتضائے عمر شعر گوئی کا شوق ہوا۔ کئی دفعہ خود انس مغفور کے پاس آئے۔ اور اپنے مشاعرے کی شرکت کی استدعا کی۔ میر صاحب نے پیرانہ سالی کا عذر کیا۔ مگر آغا صاحب اس قدر حسن عقیدت رکھتے تھے کہ نہ مانا۔ مجبوراً میر صاحب چند مشاعروں میں شریک ہوئے +

اتوار کی صحبت
میر صاحب کے یہاں ہر اتوار کو ایک صحبت ہوا کرتی تھی۔ شہر کے اکثر نامی شعراء اور رؤسا اور اہل استعداد آیا کرتے تھے۔ مثلاً قلق۔ بحر۔ امیر۔ میر کلو عرش۔ مخدومی جناب صفی صاحب کے والد ماجد۔ مولانا فضل علی صاحب مرحوم۔ تعشق۔ عشق۔ صابر۔ اچھے صاحب عیش ان لوگوں سے تو گویا اتوار ناغہ ہی نہ ہوتا تھا۔ حکیم شفاء الدولہ مرحوم کے بھائی میاں فلک مرحوم صرف شرکت صحبت کی غرض سے لکھنؤ اکثر آیا کرتے تھے (اللہ اکبر ایک وہ زمانہ تھا۔ اور ایک ہمارا زمانہ ہے کہ شعر و سخن کے تذکرے گویا کہ اس وقت کے مقابلہ میں بالکل نہیں ہوتے) چاء بسکٹ۔ شاہی کباب۔ روغنی روٹیاں۔ تواضع میں پیشکش کی جاتی تھیں۔

اس صحبت میں ہر قسم کے ذکر اذکار ہوتے تھے کبھی شاہی زمانہ کے قصے چھڑ گئے کبھی شاعری پر بحث ہونے لگی۔ کبھی لغوی تحقیقات ہونے لگی۔ اور کبھی شعر خوانی۔ جناب رشید و حمید فرماتے تھے۔ کہ دادا صاحب (جناب انس) شیخ ناسخ کا ذکر اکثر کیا کرتے تھے۔ اور عجیب عجیب و دلچسپ حکایات بیان کرتے تھے۔ مثلاً۔

نقل

ایک مرتبہ شیخ صاحب کی خدمت میں غزل لے کر ٹکسال والے مکان میں حاضر ہوا۔ جیسے ہی دروازہ میں قدم رکھا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ موری بند کرادی ہے تمام انگنائی میں پانی بھرا ہوا ہے۔ اور بیچ صحن میں خود بدولت چوکی بچھائے بیٹھے ہیں مجھے ہنسی آگئی۔ لیکن اُن کے خوف سے فوراً ضبط کیا۔ جب میری طرف دیکھا میں نے سلام کیا۔ کہا آؤ۔ اُن کے اس فرمانے پر قریب تھا کہ میں بے اختیار ہنس پڑوں۔ لیکن پھر میں نے ضبط کر کے عرض کیا۔ کہ حضور کیونکر آؤں۔ چاروں طرف تو پانی

بھرا ہوا ہی۔ فرمایا ہاں۔ پھر آدمی کو پکارا۔ صلابت! صلابت! وہ آیا تو اُس سے کہا بُھرا لاؤ۔ وہ ایک لمبا سا بُھرا لایا وہ رکھا گیا۔ اور میں اُس کے ذریعہ سے چوکی پر پہنچا۔

اب شیخ صاحب نے فرمایا: "اُنس تم سمجھے یہ میں نے کیا کیا ہی" میں نے عرض کیا: "جی نہیں" فرمایا "آتے تو چوک کی سیر کو ہیں جب وہاں سے جی بھر گیا تو کہتے ہیں چلیے ناسخ کے شعر سنیں۔ نہ سمجھتے ہیں نہ بوجھتے ہیں کمبخت دماغ پریشان کرتے ہیں۔ یہ ترتیب میں نے انھیں لوگوں کے لیے کی ہی۔ اب کیونکر میرے پاس آئیں گے۔ یکم بُھرا ہٹوا دیا۔

جناب اُنس نے یہ نقل بیان کی۔ لوگوں کی یہ کیفیت تھی کہ مارے ہنسی کے لوٹے جاتے تھے۔

چونکہ اس صحبت کے سلسلہ میں میر کلو عرش کا ذکر بھی آگیا ہی۔ لہذا اُن کا بھی مختصرا ذکر کر دینا فرض سمجھتا ہوں۔ کسی تذکرہ نویس نے میر کلو عرش کے مدفن کا نشان نہیں دیا ہی۔ یہ امر اتفاقی ہی کہ رشید نے اس صحبت کے سلسلہ میں اُن کی قبر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ کہ عرش کی قبر اس امام باڑہ کے صحن میں ہی۔

میر کلو عرش | میر کلو عرش۔ خلف ناخدائے سخن میر مرحوم۔ گو زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے مگر اُن کی خوش گوئی زبان زد عوام تھی۔ جناب اُنس سے قدیمانہ مراسم تھے۔ اور کوئی ذاتی آمدنی بھی نہ تھی اس وجہ سے میر صاحب ہی کے پاس رہتے تھے۔ میر اُنس صاحب کی وضعداری اور فراخ دلی نے عرش مغفور کو کبھی شکایت کا موقع نہ دیا۔ ورنہ ممکن تھا کہ میر کلو عرش ایسا سخن گو لکھنؤ ایسے شہر میں کسی دوسری جگہ رہ کر بھی اپنی زندگی عزت سے گذار سکتا تھا ہاں یہ لطف شعر گوئی اور صحبت اہل علم اُن کو اور کسی جگہ میسر نہیں ہو سکتی تھی۔ پرانے لوگ تھے

زندگی ایک روش پر بسر کرنا پسند کرتے تھے۔ اگر موجودہ طرزِ تمدن کی طرف نظر ڈالو تو اس کے آگے ہیچ معلوم ہوتا ہے۔

حلیہ

میر کلو عرش کی رنگت سانولی کشیدہ قامت تھے۔ اوسط کا جسم تھا۔ سر پر ٹوپی اونچی چولی کا انگرکھا اور کلی دار پائجامہ استعمال کرتے تھے۔ گھیتلا جوتا۔ یا بوٹ پہنتے تھے۔ آخر عمر میں بسبب پیرانہ سالی کمر خم ہو گئی تھی۔ اور افیون بھی کھانے لگے تھے۔ ہر وقت آنکھیں بند رہتی تھیں حقہ سامنے لگا رہتا تھا۔ جناب رشید جناب حمید اکثر ان سے مہذب مذاق کر لیا کرتے تھے۔ مثلاً ان کے سامنے حقہ سے چلم اتار کے دوسرے حقہ پر رکھدی اور غائب ہو گئے۔ انھوں نے تھوڑے سے مراقبہ کے بعد جب کش لیا تو احساس ہوا کہ بغیر چلم کا حقہ بول رہا ہے۔ اب آنکھ کھولی تو دیکھا کہ چلم ندارد ہے۔ صرف یہ کہہ کے کتفا کی " یہ لڑکے بڑے شریر ہیں " وضع داری کی اس قدر پابندی کی کہ انتقال بھی یہیں ہوا اور دفن بھی یہیں ہوئے۔ میر محمد جان صاحب شاد انھیں سے اصلاح لیا کرتے تھے۔

ایک صاحب شاد مرحوم کی زبانی ناقل ہیں۔ کہ میر کلو عرش نے وضع میں داخل کر لیا تھا۔ کہ پانچ بجے قریب شام تحسین کی مسجد کے چبوترہ پر بیٹھا کرتے تھے۔ اور چاروں طرف شعرائے نامی ہوتے تھے۔ بڑے نازک مزاج تھے کسی رئیس کی طرف نظر اٹھا کے نہ دیکھتے تھے " یہ وہی تحسین کی مسجد ہے جہاں میر کلو عرش کا نازک مزاج باپ میر تقی میر فاقہ مستی کی حالت میں ایک دفعہ بیٹھا ہوا تھا کہ سعادت علی خاں بہادر کی سواری سامنے سے نمودار ہوئی " نگاہ روبرو " کی صدائیں بلند ہو کر بڑے بڑے روساکا سرِ تسلیم خم کرتی جاتی تھیں۔ مگر اس بادشاہِ سخن پر شوکتِ شاہی کا کچھ بھی اثر نہ ہوا حتےٰ کہ سلام تک نہیں کیا۔ سعادت علی خاں بہادر کو نہایت ناگوار ہوا۔ اور انشا سے جو اس وقت

ہم رکاب تھے پوچھا۔ یہ کون شخص ہی۔ اُنھوں نے عرض کیا۔ کہ یہ وہی گدائے متکبر ہی جس کا ذکر اکثر حضور میں آچکا ہی۔ اور شاید اس وقت بھی فاقہ سے ہوگا۔ سعادت علی خاں نے ہواخوری سے واپس آکے ایک ہزار روپیہ اور خلعت میر صاحب کو بھیجا جسے اُنھوں نے بہزار دقّت منظور کیا۔" (ماخوذ از آبِ حیات)

عرش کی نظرِ استغنا پیوندزدہ انگرکھے کو قبائے زربفت سے بہتر سمجھتی تھی۔ آخر میر ہی کے تو بیٹے تھے۔ ذیل کے دو شعر رشید مرحوم کی زبانی سنے گئے تھے۔ دیوانِ عرش میں موجود نہیں۔

مُدّت ہوئی نہیں خبرِ رفتگاں مجھے | یوسف وہ ہوں کہ چھوڑ گیا کارواں مجھے
بے یار گور میں بھی نہیں ایک جا قرار | لے جائے گی یہ وحشتِ دل اب کہاں مجھے

اب میں پھر اُنس کے حالات کی طرف آتا ہوں۔ اور اُن کے واقعاتِ عمر مجملاً بیان کرتا ہوں

اُنس اور معاش | زمانۂ شاہی میں آپ کا اسم مجرائیوں میں تھا۔ اور سو روپیہ تنخواہ شاہ اودھ کی سرکار سے ملتے تھے۔ لیکن اُن کو کبھی دربار میں مثل اپنے والد کے رسوخ حاصل ہوا اور سبب اس امر کا وہی آغا میر کی چشمک تھی۔ منورالدولہ بہادر سے اور ان سے نہایت تپاک تھا۔ ممکن ہی ان دونوں صاحبوں کی دوستی کے کچھ اسباب ہوں لیکن ہم کو جو کچھ معلوم ہی وہ یہ ہی کہ جناب اُنس کو فنِ تیراندازی میں ید طولےٰ حاصل تھا۔ گویا کبھی تیر خطا ہی نہ کرتا تھا۔ منورالدولہ بہادر کو بھی تیر لگانے کا بہت شوق تھا۔ اکثر شکار میں ان دونوں صاحبوں کا ساتھ رہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُن کو ان سے بہت اُنس تھا۔ منورالدولہ بہادر کی محبت کا اندازہ اس حکایت سے ہوتا ہی۔

واقعہ | ایک مرتبہ منورالدولہ بہادر نے شکار پر تشریف لے جانے کا ارادہ کیا۔

ملازموں کو حکم دیا کہ سامان درست ہو۔ جب تیار ہوگیا۔ آدمی کو حکم دیا کہ جناب اُنس کی خدمت میں جاؤ اور ہماری طرف سے کہو کہ سامان شکار تیار ہے۔ صرف آپ کی دیری ہے۔ آدمی روانہ ہوا اور جناب اُنس کی خدمت میں پہنچ کر عرض کیا۔ یہ فوراً اُٹھے اور اپنا سامان درست کرنے لگے۔ جب جناب اُنس کے آنے میں دیر ہوئی تو منورالدولہ نے ہاتھی منگوایا اور اُس پہ سوار ہوئے۔ اور برابر اپنے صاحبزادہ امجد علی خاں بہادر کو بٹھایا۔ اور یہ حکم دے کر کہ جناب اُنس تھوڑی دیر میں تشریف لانے والے ہیں۔ اُن کو فلاں سواری پر روانہ کر دینا۔ اور شکارگاہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ دو ہی قدم فیل کوہ پیکر نے جنبش کی تھی کہ فنس جناب اُنس کی نمودار ہوئی۔ عرض کیا گیا کہ میر صاحب قبلہ تشریف لا رہے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے وہ سامنے فنس آرہی ہے۔ فیلبان کو حکم دیا گیا ہاتھی روکے۔ اُس نے روک لیا۔ اتنے میں میر صاحب کی فنس بھی آپہنچی۔ کہاروں نے (بول مہرا) کہہ کر فنس کاندھوں سے اُتار کر زمین پر رکھی۔ میر صاحب باہر تشریف لائے۔ سلام کیا۔ نواب سلام دینے کے بعد فرمایا کہ معاف کیجیے گا۔ آپ کو کسی قدر دیر ہوئی۔ اور یہاں آتشِ شوق اِس قدر بھڑکی۔ کہ بغیر آپ کے روانہ ہونے پر مجبور ہوگیا۔ یہ فرما کر ہاتھی کو بٹھانے کا حکم دیا۔ جب وہ بیٹھا تو اپنے صاحبزادہ سے فرمایا کہ تم دوسری سواری پر آؤ۔ اور میر صاحب سے کہا آئیے۔ ہر چند میر صاحب نے کہا آپ صاحبزادہ کو کیوں تکلیف دیتے ہیں۔ میں دوسری سواری پر آجاؤنگا۔ لیکن منورالدولہ بہادر نے نہ مانا۔ اور کہا۔ ارے بھئی آؤ ہم تم باتیں کرتے چلیں گے۔ راستہ خوب کٹے گا۔ اور میر صاحب کو اپنے ساتھ بٹھایا۔ اور روانہ ہوگئے۔ امجد علی خاں بہادر کو بمقتضائے سن یہ امر ناگوار ہوا۔ اور اُس دن شکار پر تشریف بھی نہ لے گئے۔ بلکہ اپنے دولت خانہ پر واپس آگئے۔ اور کئی روز تک

اپنے والد ماجد کے اُس وسیع دسترخوان پر جہاں روزانہ کھانا کھاتے تھے نہ حاضر ہوئے باپ نے بھی نہ بلوایا۔ رفتہ رفتہ یہ بات سب کو معلوم ہوگئی۔ تا اینکہ معزز مصاحبوں نے امجد علی خاں صاحب بہادر کو سمجھایا۔ اور یہ دسترخوان پر حاضر ہوئے۔ منورالدولہ بہادر نے فرمایا۔ تم کئی روز سے کہاں تھے کہ کھانے میں شریک نہ ہوئے۔ عرض کیا۔ کچھ طبیعت اچھی نہ تھی۔ فرمایا۔ یہ تو بہانہ ہے۔ ہم کو جو سبب ہے وہ معلوم ہے۔ اگر تم زندگی بھر کھانے میں نہ شریک ہوتے تو میں بھی زندگی بھر نہ بلواتا۔ یاد رکھو! اُنس اور منورالدولہ ایک روح اور دو قالب ہیں۔ جناب اُنس کو بھی منورالدولہ سمجھو۔ اور اگر یہ نہ سمجھو تو مجھ کو ضرور ہی سمجھو۔ فرماں بردار بیٹے نے گردن جھکالی +

لکھنؤ اور سنہ ۵۷ کا غدر

اس سے قبل تحریر ہو چکا ہے کہ جناب اُنس کا اسم مجرائیوں میں تھا۔ جب انقلاب سلطنت ہوا۔ اور واجد علی شاہ کلکتہ بھیج دیے گئے تو وہ جاتا رہا۔ سنہ ۵۷ء کے غدر میں سب ہی کو بھاگنا پڑا۔ سرکار کمپنی کے حکم سے سارا شہر خالی کرایا گیا۔ ان کا خاندان بھی کہیں چلا گیا۔ گوروں، بھوٹیوں نے تمام شہر کا نقد و جنس لوٹ لیا۔ ان کا بھی مال و اسباب غارت ہوگیا۔ امن و امان ہو جانے پر سب آکر آباد ہوئے۔ ان کا خاندان بھی آیا۔ چونکہ مال و متاع لٹ گیا تھا۔ اور کوئی ملازمت کا سلسلہ بھی نہ تھا۔ اس وجہ سے تکلیف میں بسر ہونے لگی۔ اور ایک عرصہ تک یہی کیفیت رہی۔ اور ان مصائب نے اُنس کے جوہر قناعت پر اور جلا کی۔ لیکن مصداق اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا اُن ساعتوں کے آثار بھی ظاہر ہونے لگے۔ جو آئندہ ایک زمانہ تک اُنس کو ایک فرد فارغ البال کا لقب عطا کرنے والی تھیں۔

اُنس برسرکار ہوتے ہیں

جب نواب ملکہ جہاں جو محمد علی شاہ کی بی بی تھیں لکھنؤ آئیں۔ تو اُن کو ایک داروغہ کی ضرورت ہوئی۔ ایک تحریر منورالدولہ بہادر کے پاس اس مضمون کی بھیجی۔

تم ہمیشہ سے ہمارے یہاں کے خیرخواہ رہے ہو اور اُمید ہی کہ اب بھی تمہارا وہی خیال
ہوگا۔ ہم کو ایک لائق اور متدین اور منتظم داروغہ کی ضرورت ہی۔ اگر تمہارے علم میں
کوئی ایسا شخص ہو تو ہمارے پاس بھیج دو۔ اس تحریر کے دیکھتے ہی منور الدولہ کے ذہن
میں جناب اُنس ہی آئے۔ آدمی بھیج کر اُن کو بلوایا اور وہ تحریر دکھا کر کہا کہ میں نے آپ کو
تجویز کیا ہی۔ اور اسی وجہ سے آپ کو بلایا ہی۔ اُنھوں نے انکار کیا۔ اور کہا عورت کی
ملازمت میں ناپسند کرتا ہوں۔ قصّہ کوتاہ منور الدولہ بہادر نے اتنا اصرار کیا کہ میر صاحب کو
مجبوراً منظور ہی کرنا پڑا۔ منور الدولہ بہادر نے نواب ملکہ جہاں کو جواب میں لکھ دیا۔ کہ میں نے
موافق آپ کی منشا کے ایک صاحب کو تجویز کر دیا ہی۔ اور وہ فلاں روز حاضر ہونگے۔
میر صاحب قبلہ اس قدر مفلس تھے۔ کہ لباس کا انتظام بھی جیسا کہ چاہیے نہ تھا۔ اور
اس فکر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کہ کہاں سے لباس کا انتظام کروں۔ کہ اتنے میں مہر جبیں قدر
بہادر کے اُستاد مولوی شیخ احمد حسین صاحب جو میر صاحب کے شاگرد تھے آئے اور
متردد دیکھ کر عرض کیا کہ آج کچھ میں آپ کو متفکر پاتا ہوں۔ فرمایا کچھ نہیں۔ اُنھوں نے
فرمایا میں نہ مانوں گا۔ کوئی نہ کوئی فکر تو ضرور ہی۔ میر صاحب قبلہ نے سارا قصہ بیان
کر دیا۔ وہ سُن کر خاموش ہو گئے۔ اور بعد اس کے چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد
پھر آئے۔ اور میر صاحب کی خدمت میں ایک رومال جس میں چالیس اشرفیاں
بندھی ہوئی تھیں۔ پیش کیا۔ میر صاحب کو اپنی تمام عمر میں ایسا اتفاق نہیں ہوا تھا
مارے شرم کے پسینے پسینے ہو گئے۔ گردن جھکا کر صاف انکار کر دیا۔ اُنھوں نے
عرض کیا۔ آپ کچھ اور خیال نہ فرمائیے۔ یہ میں آپ کو قرض دیتا ہوں۔ جس وقت
آپ کے پاس ہو۔ آپ مجھے دے دیجیے گا۔ میں تقسم کہتا ہوں۔ کہ لے لونگا۔

اس پر بھی میر صاحب نے انکار ہی فرمایا۔ لیکن اُنھوں نے اصرار کو اس حد پر پہنچایا کہ اُن کو لیتے ہی بن پڑیں۔ میر صاحب نے کپڑوں کا انتظام کیا۔ اور تاریخ معینہ پر ڈیوڑھی پہ حاضر ہوئے۔ محل دار نے جا کر دست بستہ بیگم صاحب سے عرض کیا۔ حضور وہ میر صاحب حاضر ہیں۔ بیگم صاحبہ نے فرمایا۔ کون۔ محل دار نے کہا حضور نے تم مجھے یاد نہیں رہا۔ بھولا سا بتایا تھا۔ وہی میر صاحب جن کا پانسو میں نور الدولہ بہادر نے لکھا تھا۔ فرمایا۔ ہاں۔ ہاں۔ انھیں جا کر بٹھاؤ۔ پھر پردہ کر کے اندر بلایا۔ اور بعد بات چیت کے ایک سو روپیہ ماہوار کی تنخواہ مقرر کی۔ اور اس وقت ایک ہزار روپیہ اور ایک خلعت مرحمت فرمایا۔ میر صاحب اپنے فرض منصبی کو انجام دینے لگے۔

پرامیسری نوٹ گم گئے

ایک روز ملکہ جہاں صاحبہ نے فرمایا کہ دروغہ صاحب ہمارے پاس بارہ ہزار کے پرامیسری نوٹ تھے۔ بسند و قچہ میں رکھے تھے۔ اُسی کا کچھ نوٹ اُن میں غائب ہو گئے کسی طرح اُن کا پتہ لگاؤ۔ شاید وہ مل جائیں۔ ہم تو قدردان ہیں۔ میر صاحب نے عرض کیا بہت خوب۔ خیال رکھوں گا۔ لیکن جہاں تک میں خیال کرتا ہوں۔ اُن کا ملنا دشوار ہے۔

صاحب تاریخ اودھ لکھتے ہیں۔ بعد غدر نوٹوں کی اس قدر ستیاناسی ہوئی تھی۔ بیان سے باہر ہے۔ اونے ادنے آدمیوں کے پاس ہزاروں کے نوٹ دکھائی دیتے تھے۔ مگر سرکار نے ممانعت کر دی تھی۔ کہ کوئی نوٹ نہ خریدے۔ اُس پر بھی ہزار کا نوٹ دس روپیہ کو فروخت ہو گیا۔ اور لوگ مالا مال ہو گئے۔ چونکہ ممانعت خرید ہو چکی تھی۔ لہٰذا ملکہ جہاں کے نوٹ بک نہ سکے تھے۔ عجب اتفاق پیش آیا۔ یا یہ کہیے کہ اُس کی قسمت جاگی۔ وہ صندوقچہ ایک سکھ لے گیا تھا۔ اُس میں جو کچھ نقد تھا وہ تو اُس نے لے لیا مگر نوٹ اُس کے مطلب کے نہ تھے۔ اُن کو لے کر ابو تراب خاں صاحب جن کا نام مشہور

ان کے پاس گیا۔ انھوں نے پانچ سو دے کر اُن سے لے لیے۔ یہ خبر میر صاحب کو بھی کسی ذریعہ سے معلوم ہوئی۔ میر صاحب اُن کے پاس گئے۔ اور دریافت کیا۔ انھوں نے کہا۔ ہاں میں نے یہ مقدار دے کر لیے ہیں۔ میر صاحب نے کہا۔ وہ نوٹ ملکہ جہاں کے ہیں۔ آپ انھیں دے دیں۔ اور جو رقم آپ نے دی ہو وہ مجھ سے لے لیں انھوں نے جواب دیا۔ میں اس رقم پر نہ دونگا۔ بلکہ اس مثل کے موافق۔ کہ "جاتا دھن دیکھیے تو آدھا دیجیے بانٹ" چھ لاکھ روپیہ لونگا۔ غرض کہ میر صاحب دس ہزار تک دیتے رہے مگر یہ معاملہ طے نہ ہوا۔

نوٹ مل گئے

شاہی زمانہ میں میر صاحب نے ایک انگریز کو پڑھایا تھا۔ اب اس وقت میں وہ چیف کمشنر ہو کر آئے۔ یہ جو ان کو معلوم ہوا۔ یہ ملنے گئے۔ صاحب اپنے اُستاد کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ نہایت احترام سے بٹھایا۔ اور بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اثنائے کلام میں میر صاحب نے نوٹ والا قصہ بھی بیان کیا۔ چیف کمشنر نے کہا۔ کل ہم اُن کو بلوا کر دلوا دینگے۔ دوسرے روز ابو تراب خاں صاحب کے یہاں چپراسی پہنچا۔ اور جا کر کہا۔ چیف کمشنر صاحب نے آپ کو بلایا ہے۔ یہ سُن کر وہ گھبرا گئے اور ایک کھلبلی مچ گئی۔ اور سبب اس کھلبلی مچ جانے کا یہ تھا۔ کہ اُس وقت جس پر باغی ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ اُس کو سزائے موت یا اور دوسری سزائیں دی جاتی تھیں۔ غرض کہ ابو تراب خاں صاحب گئے۔ صاحب نے نوٹ میر صاحب قبلہ کو دلوا دئے۔ اور پانچ سو روپیہ میر صاحب نے ابو تراب خاں صاحب کو دے دیئے۔

داروغہ صاحب خوش خوش نوٹ لے کر آئے۔ اور نواب ملکہ جہاں کے سامنے پیش کر دیے۔ وہ مغفور میر صاحب کی اس کارگذاری پر بہت خوش ہوئیں

اور کھوئے ہوئے نوٹ کے مل جانے پر بہت تعجب کیا۔ اس حُسنِ سعی کی وجہ سے اُن کے دل میں بہت جگہ ہوگئی۔ اور اُن کی بہت رعایت کرنے لگیں۔ بلکہ مثل عزیزوں کے سمجھنے لگیں +

نواب ملکۂ جہاں کی تنخواہ ہوگئی

دوسرا کارِ نمایاں میر صاحب سے یہ ایسا ہوا۔ جس کی وجہ سے نواب ملکۂ جہاں اُن کو بھائی کہنے لگیں۔ اُنھیں چیف کمشنر صاحب کے پاس یہ کبھی کبھی جایا کرتے تھے۔ ایک روز صاحب نے کہا "آپ ہمارا اُستاد ہے۔ اگر کوئی کام ہو تو فوراً ہم سے کہیے ہم اُسے ضرور کردے گا۔" انھوں نے کہا۔ ہمیں آپ سے یہی اُمید ہے۔ میرا تو اس وقت کوئی کام نہیں۔ البتہ میں جن کا ملازم ہوں۔ اُن کا کام ہے۔ اگر آپ اسے انجام دے دیں تو میں نہایت ممنون ہوں گا۔ صاحب نے کہا وہ کیا؟ میر صاحب نے کہا۔ آپ کو معلوم ہے۔ میں نواب ملکۂ جہاں کا داروغہ ہوں۔ اور وہ بی بی محمد علی شاہ کی ہیں۔ افسوس ہے کہ سرکار کمپنی نے اُن کی طرف توجہ نہ کی۔ اور بی بی جلیل القدر بیگم کی کچھ تنخواہ نہ ہوئی۔ صاحب نے کہا۔ اچھا۔ ہم کوشش کرے گا۔ میر صاحب وقتاً فوقتاً وہ محبت نامے جو محمد علی شاہ نواب ملکۂ جہاں کو لکھتے تھے۔ اور یہ اُن کو لکھتی تھیں۔ اور دوسرے کاغذات شاہی تلاش کرکے نکالتے۔ اور چیف کمشنر صاحب کو دکھاتے رہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ان پر نواب ملکۂ جہاں کا مرتبہ ظاہر ہوگیا۔ اور آخرکار اُنھوں نے ایسی رپورٹ کردی۔ کہ کئی ماہ کے بعد ساڑھے چار ہزار کی پنشن کا حکم آگیا۔ صاحب نے یہ حکم میر صاحب کو سنایا۔ میر صاحب کی اُس وقت کی خوشی کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا

الغرض میر صاحب اپنی سعی میں کامیاب ہوئے۔ لیکن یہ سارا قصہ نواب ملکہ جہاں سے بیان نہ کیا۔ جب مہینہ ختم ہوا تنخواہ جاکر وصول کی۔ اور اُسے لیے ہوئے بیگم صاحبہ کی

خدمت میں آئے۔ اور سامنے لاکر رکھ دیے۔ بیگم صاحبہ نے دریافت فرمایا۔ یہ روپیہ کیسے ہیں۔ میر صاحب نے عرض کی۔ آپ کی تنخواہ ہے۔ بیگم صاحبہ نے کہا کیسی تنخواہ۔ میر صاحب نے اول سے آخر تک سارا قصہ بیان کیا۔ بیگم صاحبہ ان کی اس کوشش پر بہت ہی خوش ہوئیں اور اس روز سے ان کو بھائی کہنے لگیں۔ اور چاہا۔ کہ اس کا صلہ خاطر خواہ دوں۔ لیکن میر صاحب نے انکار کیا۔ اور عرض کی۔ اس کا صلہ میں یہ چاہتا ہوں۔ کہ آپ تمام بزرگان دین کے مزارات کی زیارت کے لیے تشریف لے چلیے۔ اور مجھے بھی ساتھ لیجیے بیگم صاحبہ راضی ہوگئیں۔ سامانِ سفر درست ہوگیا۔ اور اس نتیجہ خیز سفر کی تاریخ بھی معین ہوگئی۔

چونکہ میر صاحب قبلہ ملکۂ جہاں کے ہمراہ جا رہے تھے۔ لہذا یہاں کے تمام انتظام کے لیے ایک دوسرے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس کے لیے میر صاحب کے صاحبزادہ۔ جناب صابر تجویز ہوئے۔ اور پچاس روپیہ ماہوار کی تنخواہ کی گئی۔ اور تمام کنجیاں ان کے حوالہ کی گئیں۔ اور نقد و جنس و جواہرات اور تمام اثاثہ کی دو فہرستیں تیار ہوئیں۔ ایک جناب صابر کو دی گئی۔ اور دوسری نواب ملکہ جہاں کے پاس رہی۔ تحویل میں نقد روپیہ بارہ لاکھ تھا۔ غرض کہ یہ سب انتظام ہو کر بیگم صاحبہ حج اور زیارت عتبات عالیات کو روانہ ہوگئیں۔ اور سات برس تک اس مبارک سفر میں رہیں۔ نواب ملکۂ جہاں کی اس سات برس کی عدم موجودگی میں لکھنؤ میں بعض واقعات جو گذرے ہیں۔ وہ جناب صابر کے حالات میں لکھے جائیں گے۔

جنابِ میر کی رامپور میں طلب

جنت آشیاں نواب کلب علی خاں صاحب بہادر جیسے علم دوست و قدر دان اہل علم تھے

سب کو معلوم ہے۔ کیسے کیسے باکمال۔ فاضل۔ عالم۔ شاعر۔ بلکہ ہر فن کے جاننے والے۔ آپ کے دربار میں حاضر رہتے تھے۔ میر صاحب کے علم و کمال کا شہرہ

آپ کے سمع ہمایوں تک پہنچا۔ بہت مشتاق ہوئے۔ اور چند بار تحریر کے وسیلہ سے طلب فرمایا۔ لیکن میر صاحب اس وقت ضعیف ہو گئے تھے۔ سفر کی صعوبت مدِ نظر رکھ کر پیرانہ سالی کا عذر واقعی کیا۔ آخرکار ۱۲۷۵ھ میں اپنے اُستاد جناب منشی امیر احمد صاحب مینائی کو لینے کے لیے روانہ فرمایا۔ منشی صاحب لکھنؤ تشریف لائے۔ منشی محمد احمد صاحب ضریر خلف امیر مینائی بھی ہمراہ تھے۔ میر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ منشی صاحب نے کہا میں آپ کے لینے کے لیے آیا ہوں۔ میر صاحب نے کہا۔ دیکھیے میری یہ حالت ہے۔ منشی صاحب نے کہا۔ ظاہر ہے کہ عالمِ پیری ہے۔ لیکن آپ کو چلنا ضرور ہوگا۔ اور میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ بہ راحت و آرام پہنچیں گے۔ غرض کہ میر صاحب نے منظور کیا اور خود مع جناب رشید و جناب عمید کے روانہ ہوئے۔

اس زمانہ میں رامپور میں ریل نہ تھی۔ مراد آباد آئے۔ اور وہاں سے رامپور پہنچے۔ دربار میں شرفِ ملازمت حاصل ہوا۔ جلال۔ امیر۔ داغ۔ تجر۔ وغیرہم موجود تھے۔ ایک عرصہ تک شعر و شاعری کا ذکر رہا۔ سلسلۂ سخن تاریخ پر پہنچا۔ جنت آشیانی ٹیپو سلطان کی تاریخ بیان فرمانے لگے۔ اور بہت دیر تک بیان فرماتے رہے۔ ایک مقام پر پہنچ کر خاموش ہو گئے۔ اور میر صاحب کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا۔ کہ اس کے آگے اگر آپ کو یاد ہو تو بیان کیجیے۔ میر صاحب نے عرض کی بہت خوب۔ اور وہیں سے بیان شروع کر دیا اور ایک عرصہ تک بیان کرتے رہے۔ اس کے بعد عرض کی کہ حضور کی سمع خراشی کا خیال ہے۔ حکم ہو تو اور عرض کروں۔ مسکرا کر فرمایا۔ معلوم ہوا کہ آپ کو تاریخ میں بھی دخل ہے۔

ایک غزل میر صاحب کی سُنی۔ اور ایک غزل اپنی سُنائی۔ آٹھ روز تک وہاں قیام ہوا

کئی مرتبہ دربار میں گئے۔ کبھی کبھی رفاہ منزل میں بھی جاتے تھے۔

داغ اور جناب انیس

ایک مرتبہ رفاہ منزل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کہ فصیح الملک حضرت داغ آئے اور ایک کونہ میں ٹوپی اُتار کر بیٹھ گئے۔ اس زمانہ میں آپ میں آزادی زیادہ تھی۔ کسی نے میر صاحب کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ حضرت آپ سے واقف ہیں۔ جواب دیا۔ نہیں۔ کہا میر انیس آپ ہی ہیں۔ جلدی سے ٹوپی پہن کر سلام کیا۔ اور اُٹھ کر ملے۔ دوسرے دن قیام گاہ پر آئے۔ ہاتھ میں اپنا دیوان قلمی لیے ہوئے تھے۔ میر صاحب سے بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ چلتے وقت اپنا دیوان دیا۔ اور عرض کیا۔ کہ وقت فرصت آپ ملاحظہ فرمایئے گا۔ میں نے ارادہ کیا تھا کہ چند غزلیں خود سناؤں۔ مگر آپ کی تکلیف کا خیال ہوا۔ جناب داغ کے جانے کے بعد میر صاحب نے جناب رشید سے جستہ جستہ مقام سے پڑھوا کر سُنا۔ تیسرے دن جناب داغ کے تغزل کی تعریف کی اور کہا "دہلی عبارت آپ ہی سے ہے" جناب داغ سے اور جناب رشید سے بے تکلفانہ گفتگو اور ان کا انھیں۔ اور اُن کا انھیں غزلیں سُنانا خالی از لطف نہیں۔

الحاصل ایک روز نواب صاحب بہادر سے وطن جانے کی اجازت چاہی۔ فرمایا۔ کہاں جایئے گا یہیں رہیے۔ عرض کیا۔ جی تو یہی چاہتا ہے۔ اس لیے کہ آپ سا باکمال قدر داں رئیس کہاں دستیاب ہوسکتا ہے۔ لیکن بُرا ہو ضعیفی کا کہ اس سعادت سے محروم رکھنے پر مجبور کرتی ہے۔ ایک رومال اور دوشالہ۔ اور چھ سو روپیہ مرحمت فرما کر رخصت کیا۔

میر صاحب خط شفیعہ خوب لکھتے تھے۔ یہی خط شفیعہ زمانہ شاہی میں اس قدر مروج تھا (اور واقعی مروج ہونے کے قابل بھی ہے) کہ ہر پڑھا لکھا اُس کی مشق کرتا تھا۔ مگر اُس

خط کے لیے ہاتھ میں بہت لوچ کی ضرورت ہی۔ دیکھا گیا ہی کہ بہت سے خوش خط حضرات شفیعہ اچھا نہیں لکھتے۔ عام طور سے یہ خط ایرانیوں میں پایا جاتا ہی۔ اکثر پُرانے کتب خانوں میں فارسی کے قلمی نسخے ایک اسی خط میں لکھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ میری رائے میں یہ حروف شفیعہ خوش خط الفاظ سے زیادہ نظر کو بھلے معلوم ہوتے ہیں +

سخاوت | میر صاحب میں فضیلت سخاوت درجۂ کمال پر تھی۔ جب کسی حاجت مند کو دیکھ لیتے تھے۔ اُس وقت اور کوئی خیال اُن کے دماغ میں راہ نہیں پاتا تھا۔ سوائے اس کے کہ کسی طرح جلد سے جلد اس کی حاجت روائی کی کوئی تدبیر کریں۔ اور بیشتر کامیاب ہی ہوتے تھے۔ جس محلہ میں رہتے تھے وہاں کے غربا کے لیے میر صاحب گویا حاتم ثانی تھے۔ جناب حمید فرماتے تھے کہ نادار اصحاب کی لڑکیوں کے لیے اکثر ایسی ایسی معقول رقمیں میر صاحب نے دی ہیں کہ لوگوں کو تعجب ہو گیا +

واقعہ | ایک مرتبہ کا واقعہ ہی کہ میر صاحب رکاب گنج میں کھڑے تھے۔ جاڑے کا زمانہ تھا۔ شالی رُومال کاندھے پر پڑا تھا۔ نیچی چولی کی جامہ وار کی اچکن پہنے تھے جو جدید بنوائی تھی۔ اُن کو امیر صورت شریف وضع پاکر ایک سائل نے سوال کیا۔ میر صاحب نے ایک رقم قلیل جیب سے نکال کر دی۔ اُس نے کہا میں اور زیادہ کا محتاج ہوں۔ میر صاحب نے کہا کہ میرے پاس سوائے اس کے اور کچھ نہیں۔ سائل نے کہا۔ کپڑے تو ہیں۔ میر صاحب نہ معلوم اُس وقت کس عالم میں تھے ملازم سے کہا گھر سے لنگی مانگ لے۔ اس نے امتثال امر کیا۔ سب کپڑے اُتار کے فقیر کے حوالہ کیے۔ حالانکہ اُس بے چارے نے لجاجت سے کئی مرتبہ کہا کہ غریب پرور میری یہ غرض نہ تھی۔ مگر جب اُس نے میر صاحب کو جوش سخاوت میں برہم پایا تو

توبھلا عذر کہاں سے لاتا۔ ناچار قبول کیا۔ اور دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔

سیرچشمی

واقعی بیرانس کو ایسا ہی سیرچشم ہونا چاہیے تھا۔ وجہ یہ تھی کہ ابتدا سے اُنھوں نے ایسی ایسی سرکاروں میں ملازمت کی تھی۔ جہاں شاہانہ شان و شوکت نظر آتی تھی کام و تفویض ہوئے تھے۔ کہ ہر وقت سیکڑوں بلکہ ہزاروں روپیہ ہاتھ سے نکلتے رہتے تھے حرصِ دُنیوی کا ذکر نہیں۔ اگر ایسا شخص بھی سخی نہ ہو تو تعجب ہے۔ علاوہ اوپر کی آمدنی کے جس کی کچھ انتہا نہ تھی۔ خود میر صاحب تنخواہ بھی معقول پاتے تھے (یعنی دوسو روپیہ ماہوار) اور یہ اُس زمانہ کا ذکر ہے جب ایک روپیہ آج کل کے دس روپیہ کی برابر تھا۔ پھر اس روزانہ کے عنایات مزید۔ چنانچہ جب میر صاحب نے کوشش کرکے نواب ملکہ جہاں بیگم صاحبہ کی تنخواہ کرائی۔ اُس وقت اُنھوں نے بجائے دوسو روپیہ کے چار سو روپیہ تنخواہ کردی۔ اور بیس ہزار روپیہ نقد دیا۔ کسی دوسرے موقعہ پر ایک مرتبہ اور پچیس ہزار روپیہ اُسی قدرشناس بیگم نے میر صاحب کو عطا فرمایا تھا۔ تاکہ میر صاحب اولاد کے لیے کوئی جائداد خرید لیں۔ اور وسیلۂ معاش قائم ہوجائے۔ مگر میر صاحب کا ہاتھ کھلا ہوا تھا۔ بھلا، روپیہ کہاں رُک سکتا تھا۔ جو ملا صرف کیا۔ یہی وجہ تھی کہ نواب ملکہ جہاں کے انتقال کے بعد میر صاحب سیرچشم مفلس رہے۔

جب ملکہ جہاں کربلائے معلی تشریف لے جانے والی تھیں۔ اُن کے ہمراہ تقریباً دوسو آدمی تھے۔ اُن کے علاوہ میر صاحب سے جس نے سفر کربلا کی استدعا کی میر صاحب نے اُس کو بغیر بیگم صاحبہ کو اطلاع دیے اپنے ساتھ لے لیا۔ اور اس طرح ایک کافی تعداد زائرین کی ساتھ لے جاکے ذخیرۂ ثواب حاصل کیا۔

لطیفہ | میرزا محمد رضا برق اُستاد جلال لکھنوی ایک مقبرہ میں مقیم تھے۔ ایک مرتبہ بیٹھے ہوئے تھے کہ میر اُنیس صاحب کی فنس نکلی۔ کسی وجہ سے میر صاحب میرزا محمد رضا کے یہاں جاتے نہ تھے۔ برق میر صاحب کو دیکھ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور بہت جُھک کے سلام کیا۔ آپ کی عادت تھی۔ کہ صاحب سلامت بہت جُھک کے کرتے تھے۔ میر صاحب نے فنس میں سے اُسی طرح آپ کو بھی بہت جُھک کے سلام کیا۔ میرزا صاحب نے کہاروں کو آواز دی۔ ذرا فنس کو روکو۔ اور میر صاحب سے پُکار کر کہا۔ یہاں بھی آپ کبھی آئیے گا؟ کہا۔ ہاں آؤں گا تو ضرور مگر ابھی تو جی نہیں چاہتا +

اُنیس اور مشاعرے

نقل | شاہی زمانہ میں آغا علی خاں شاگرد میر علی اوسط رشک مرحوم نے ایک بہت بڑا مشاعرہ کیا۔ تمام شعرائے شہر جمع تھے۔ آغا علی خاں سے اور میر انیس صاحب سے قدیمی چشمک تھی۔ اس لیے خود تو نہ گئے۔ بلکہ جناب آغا حیدر صاحب نیشاپوری کے وسیلہ سے آپ کو بلوایا۔ میر صاحب جناب تعشق کو ساتھ لے کر پہنچے۔ دیکھا مشاعرہ شاعروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ چوب دار سے دو کرسیاں منگوا کر باہر بیٹھے۔ آغا حیدر صاحب اور میر علی اوسط کو معلوم ہوا کہ میر صاحب آئے ہیں۔ فوراً اُٹھے۔ اور آواز دی "آئیے بھائی صاحب"۔ انھوں نے کہا۔ اندر جگہ نہیں جب میری باری آئے گی چلا آؤں گا۔ مگر انھوں نے نہ مانا اور اندر بلا ہی لیا۔ یہ اندر جا کر بیٹھے۔ جب ان کی باری آئی۔ غیر طرح غزل پڑھی۔ اُس کے بعد طرح میں پڑھی۔ ایک شعر پر آغا علی خاں صاحب نے کہا۔ جناب نے تو اس زمین کا خاتمہ کر دیا۔ گویا یہ فقرہ طنز آمیز تھا۔ میر انیس نے فوراً جیب میں غزل رکھ لی۔ آغا علی خاں اور دیگر حضرات نے کہا۔ کیوں کیوں فرمایئے فرمایئے

آغا علی خان سے تو کچھ نہ کہا۔ دوسروں کی طرف میر صاحب نے خطاب کر کے کہا۔ آپ کے فرمانے کے مطابق میں نے اس زمین کا خاتمہ کر دیا۔ اور آپ نے تعریف کا خاتمہ کر دیا۔ اب کیا پڑھوں گا۔

روساے شہر اور انیس

شاہزادہ میرزا سلیماں قدر بہادر جو خاندان شاہانِ اودھ کے آخری مقتدر فرد تھے۔ کبھی کبھی اکابرین لکھنؤ سے یا تو خود ملتے تھے۔ یا انھیں بلوا لیتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ میر انیس مرحوم کے پاس ہرکارہ طلب پہنچا۔ مگر میر صاحب نے عذر پیرانہ سالی کیا۔ نواب مغفور رکاب گنج خود تشریف لائے۔ سڑک پر گاڑی رکی۔ میر انیس صاحب نے اپنی فنس لگوا دی۔ اور نواب صاحب کی فنس کے ساتھ ساتھ گھر تک تشریف لائے۔ اگرچہ میر صاحب کو اس وقیع مہمان نے بہت کمزور پا کر فنس کے ساتھ نہ چلنے کی خواہش کی مگر اس وضع قدیم کے پابند نے نہ مانا۔ اور اپنے حسن اخلاق اور عقیدت کو یوں ظاہر کیا۔ میر صاحب نے کمرہ میں گاؤ تکیہ لگوا دیا تھا۔ نواب مغفور آکر رونق افروز ہوئے۔ میر صاحب نے موافق رسم قدیم ایک اشرفی اور پانچ روپیہ نذر دکھائے۔ انھوں نے فقط ہاتھ رکھ دیا جب تک بیٹھے رہے شعر و سخن کے اذکار رہے۔ خود بھی اپنا کلام سنایا۔ اور میر صاحب سے بھی سنا۔ جب چلنے لگے تو میر صاحب کا دیوان باصرار اپنے ساتھ لے گئے۔ جو اب تک اُن کے صاحبزادہ شاہزادہ ثریا قدر بہادر کے پاس موجود ہے۔ اور میر صاحب کو ایک دوشالہ اور دو سو روپیہ بھیجے۔

جناب انیس وقت آخر بہت ضعیف ہو گئے تھے۔ دس جمادی الاول ۱۲۹۱ ہجری میں انتقال فرمایا۔ بہتّر برس کی عمر پائی۔ حکیم صفدر حسین صاحب مرحوم نے یہ تاریخ کہی جو قبر پر کندہ ہے۔ اسکنہ اللہ ریاض الجنۃ۔

۱۳۰۲ھ

(۱) والد اُنس — محمد میرزا صاحب اُنس کے پانچ بیٹے تھے۔
حسین میرزا عشق ۔ احمد میرزا صابر ۔ سید میرزا تعشق ۔ سید عباس میرزا صبر
سید نواب میرزا عاشق +

ان سب حضرات کی شاعری کا سلسلہ اُستادِ وقت جناب شیخ ناسخ مغفور سے ہے

ان حضرات کا حال بھی مختصراً درجِ ذیل ہے۔

اشعار میر اُنس مغفور (شاگرد ناسخ)

رسا جو اُلفتِ زلفِ دراز ہو جائے — کمندِ بامِ حقیقت مجاز ہو جائے
تمہیں لحد میں اُتارو تمہیں نہ ہوں تلقیں — کہیں تو صحبتِ ناز و نیاز ہو جائے
عطا ہو ضبط مجھے یا اجل سے کچھ نہ کہوں — کوئی تو صورتِ اخفائے راز ہو جائے
غرض وفا و جفا سے نہیں وہ چال چلیو — کہ مجھ میں غیر میں کچھ امتیاز ہو جائے

وفورِ شوقِ شہادت سے بے قرار آئے — حضور جلد برآمد ہوں جاں نثار آئے
کسی طرح نہ ملا قاصدوں کو خط کا جواب — ہزار بار گئے اور ہزار بار آئے

جان دی پر کی نہ منت اُس ستم ایجاد کی — بددماغی دیکھنا میرے دلِ ناشاد کی
اپنی اُلفت کا مآل اچھا نظر آتا نہیں — اُن کو عادت بھولنے کی ہم کو عادت یاد کی
درد و غم سے بڑھ گیا ہے ربط ہجرِ یار میں — اب قیامت ہو گئی شادی دلِ ناشاد کی
مجھ سے اک بُت کی محبت میں کنارہ کر گیا — اب خدا صورت نہ دکھلائے دلِ ناشاد کی
رکھ کے تہمت بے قراری کی نہ آزردہ ہو یار — میں نے کس دن ہجر میں نالہ کیا فریاد کی

شعرگوئی کا مزا اے آتشؔ کب باقی رہا
رو دیا جب حضرتِ ناسخ کی شفقت یاد کی

کیا مزے تو نے دیے ہیں رحمت اے تاثیرِ ضعف — لب تک آ سکتا نہیں شکوہ ہمارے دل میں ہے

رات بھر دل سے رہیں رنج و تعب کی باتیں — فرقتِ یار نے سنوائیں غضب کی باتیں

اتنی تخصیص پہ مسرور ہے دل واہ رے دل — چشم پوشی ہے رقیبوں سے اشارے ہم سے

طول میں ہیں جو ترے قد کے برابر گیسو — کہیں برپا نہ کریں فتنۂ محشر گیسو
واہ ری مہر و وفا عاشقِ گیسو جو ہوا — پھر نہ چھوڑے کبھی اُس شوخ نے مُنہ پر گیسو

حسین میرزا عشق

لکھنؤ کے نامی مرثیہ گویوں میں تھے۔ دیوان اور مرثیوں کی جلدیں چھپ چکی ہیں۔ ان کا کلام اصولِ شاعری کی میزان میں تُلا ہوا ہے۔ جہاں انیس و دبیر کے کلام کے لوگ مشتاق ہوتے تھے۔ وہاں ان کا کلام بھی وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اوّل الذکر دونوں صاحبوں کی شہرت کے برابر برابر ان کا شہرۂ کمال بھی تھا۔ محقق فن ایسے تھے۔ کہ دوسرا نگاہوں میں نہیں سماتا تھا۔ خلاصہ یہ کہ لکھنؤ کے باکمالوں کی فہرست اوّل میں ان کا نامِ نامی بھی نظر آتا ہے۔ اب ان کے پوتے جناب عسکری میرزا صاحب مؤدب، آبائی جاگیرِ نظم کے مالک ہیں۔ اور آج کل لکھنؤ کے نامی مرثیہ گویوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اور خوب کہتے ہیں۔

جنابِ مؤدب کو رشید مرحوم سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ جس طرح جناب رشید نے اپنے مرثیہ "میں ہوں سلطان سخن مجھ سے بڑھی شان سخن۔ بن کے مطلع یہ

"مستند ہوں کہ ملی عشق کی مسند مجھ کو"

کہہ کے شاگردی عشق پر ناز کیا ہے۔ اسی طرح جناب مؤدب نے ذیل کی رباعی میں فخر شاگردی رشید ظاہر کی ہے۔

عمو ہیں رشید اُن سے یہ رشتہ ہے	دادا مرے عشق۔ اُن کے چچا شاگرد ہیں
یہ عشق کے شاگرد ہیں شاگرد رشید	تلمیذ کا یہ سلسلہ بھی اچھا ہے

رجب کی ستائیس تاریخ اکرام اللہ خاں کے امام باڑہ میں سجاد حسین صاحب ایک مجلس کرتے ہیں۔ اس میں جناب مؤدب اپنا نیا مرثیہ سُناتے ہیں۔ اس ماہ رجب کی چوبیس تاریخ سے نئے مرثیوں کی مجالس شروع ہو جاتی ہیں۔ اور خاندان انیس و دبیر

دعشق کے حیثیت مرثیہ گو مثلاً عروج، رفیع، مؤدب، فائق، حسن، قدیم، فرید، رونق افروز ممبر ہوتے ہیں۔ یہی ایک مرثیہ ہر ایک کی نسبت سال بھر تک ایک رائے قائم کرا دیتا ہی۔ سنجیدہ طبیعتیں نقادانہ نظر ڈال کے کامیابی کی مختلف تعریفوں سے ہر ایک کو سرفراز کرتی ہیں۔ جو اس امتحان گاہ میں عمدہ برآ ہو گیا۔ اُس کی امیدوں کا کیا پوچھنا۔

جناب عشق نے بتاریخ ۲۴ شعبان ۱۳۱۰ھ روز دوشنبہ انتقال فرمایا۔

سید میرزا تعشق

لکھنؤ میں سید صاحب کے لقب سے مشہور تھے۔ غزل اور مرثیہ گوئی دونوں کے بادشاہ تھے۔ خداداد طبیعت نے مرثیہ گوئی کا ایک نیا اور ہر دل عزیز رنگ ایجاد کر لیا تھا۔ جس مشاعرہ میں غزل پڑھ دیتے تھے۔ سامعین بے تاب ہو جاتے تھے۔ واد دینا کیسا کلام نے وہ اثر پایا تھا۔ کہ لوگ رو دیتے تھے۔ ان کے کچھ مرثیے اور مختصر سا دیوان غزلیات طبع ہو گیا ہی۔ دیوان غزلیات جناب ابر مرحوم اڈیٹر رسالہ معیار چھپوایا جناب تعشق سے میر انیس صاحب بہت محبت کرتے تھے۔ بلکہ ان دونوں بزرگواروں میں برادرانہ مراسم تھے۔ ایک معتبر ذریعہ سے سُنا گیا ہی کہ میر انیس مغفور اکثر اپنا نیا مرثیہ آپ کو سُنا دیتے تھے۔ جس کی وجہ سوائے انتہائے اُلفت کے اور کیا ہو سکتی ہی۔

کم شہرت کی وجہ

سید صاحب نے اپنا زیادہ حصّہ عمر کربلائے معلّی میں صرف کیا جس کی وجہ یہ تھی کہ میر عشق مغفور کا چراغ لکھنؤ میں جل رہا تھا۔ مگر انھوں نے جو نئے مرثیے کہے اور مجلسوں میں پڑھے۔ تو مرجعیت عام ان کی طرف ہونے لگی سمجھے کہ اگر میں یہ سلسلہ جاری رکھتا ہوں۔ تو زمانہ میر عشق کا مدِ مقابل بنائے دیتا ہی جس کو یہ نا پسند

کرتے تھے۔ لہٰذا دوبارہ زیارت کربلائے معلّٰی پر آمادہ ہوگئے۔ گویا ارادۂ ہجرت کرلیا۔ میر عشق کے انتقال کے بعد واپس آئے۔ اور پھر وہ شہرت حاصل کی کہ محتاجِ بیان نہیں۔ ان کے ایک فرزند سیّد نواب میرزا تعلّق مرحوم تھے۔ یہاں ان دونوں حضرات کے مفصّل حالات بیان کرنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ مقصود میر ارشید کے حالات سے ہی۔ روشِ تحریر اس طرف کھینچ لائی تو ان حضرات کا بھی مجملاً ذکر ہوگیا۔

سیّد صاحب نے ستّر سال کی عمر پائی۔ ۴ رمضان المبارک روز شنبہ ۱۳۰۹ھ میں انتقال ہوا۔ باغ میر عشق میں زیر امام باڑہ ایک حجرہ ہی۔ اُس میں مدفون ہوئے۔ ناسخ وقت جناب مولوی علی میاں صاحب کامل مغفور نے یہ تاریخ وفات کہی

از زبانِ ہاتفِ غیبی بناسخ گویمش　　رفتہ سوئے مجلسِ جانِ ہمیرآں جناب
۱۳۰۹ھ

احمد میرزا صاحب صابر

جنابِ صابر۔ یہ محمد میرزا صاحب اُنس کے منجھلے بیٹے اور جنابِ رشید کے والدِ ماجد تھے۔

حلیہ لباس | رنگت گوری تھی۔ ماتھا بلند۔ آنکھیں بڑی بڑی۔ کثرتِ کتب بینی سے نظر کمزور ہوگئی تھی۔ موٹے تازے تھے۔ رسمِ قدیم کے موافق سر پر پٹے تھے۔ اعضا میں بہت مناسبت تھی۔ نتیجہ یہ نکلتا ہی کہ خوب صورت تھے۔ وضع بالکل سادی تھی۔ پچگوشیہ ٹوپی پہنتے تھے۔ کرتہ نیچا۔ آٹھ کلی کا مشروع کا پائجامہ ہوتا تھا۔ جوتہ گھیتلا اشرفی کا بر علی کے ہاتھ کا بنایا ہوا۔ بر علی اُس وقت لکھنؤ میں گھیتلے جوتہ کی ساخت میں بہت مشہور تھا اکثر رؤسا و شرفائے شہر اس کے ہاتھ کا جوتہ پہنتے تھے۔ چنانچہ میر انیس میر مونس

جناب صابر نے ہمیشہ اسی کا بنایا ہوا جوتہ پہنا۔ کیا وضع کے پابند لوگ تھے۔

شوق تعلیم و تعلم اور نظم سے پرہیز

جناب صابر بڑے ذی استعداد تھے۔ مولوی انور علی صاحب فرنگی محلی مرحوم سے درسیات ختم کیے تھے۔ اور بجائے خود کتب بینی سے اس قدر قوتِ علم بڑھائی تھی۔ کہ طالبانِ علم گھر پر درس لینے آتے تھے۔ ان کے نمایاں شاگردوں میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ حکیم سیّد باقر مرحوم۔ میر اولاد علی مرحوم۔ شیخ ہادی علی مرحوم۔ میر عسکری مرحوم۔ شیخ ضامن علی مرحوم۔ جناب صابر تینوں زبانوں (یعنی عربی۔ فارسی۔ اردو) میں شعر کہتے تھے۔ اور شاگردوں کے کلام پر اصلاح بھی دیتے تھے۔ کیفِ علم میں اس قدر سرشار تھے۔ کہ کبھی صنفِ شعر میں زیادہ نمایاں ہونے کی کوشش نہیں کی۔ اور نہ اس قدر کہا کہ قابلِ اشاعت ہوتا۔

شاذ سے قطع نظر کر کے قاعدہ ہے کہ ایک صاحبِ استعداد اگر فطرتاً ذوقِ شعر رکھتا ہے۔ تو اس کو کبھی اس حد تک نہیں پہنچاتا۔ کہ شاعری کے بڑھتے ہوئے خیالات اس کو مسائلِ علمیہ کی فکر سے باز رکھیں۔ جو کیفیت شاعر پر دورانِ نظم میں طاری ہوتی ہے۔ اور جن کاوشوں سے وہ ایک خیال کو نظم میں ادا کرنا چاہتا ہے۔ اور کامیاب ہو کر خوش ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک درس دینے والا مسائلِ علمیہ کے حل میں غرق ہو کے وہ لطف اُٹھاتا ہے کہ فضلا ہی خوب سمجھتے ہیں +

شاعر کا بدل ما یتحلل دادِ سخن ہے۔ اور مدرس کے رُوحانی سرور کا سبب یہ ہے کہ جو کچھ اُس نے تقریر کی ہے۔ وہ پڑھنے والے کے ذہن نشین ہو جائے۔ بہرحال جناب صابر نے اپنے وقت کو صرفِ علم کر دیا۔ اور شعر کی طرف توجہ کم کی۔ آتش و ناسخ کے مشاعروں میں شریک ہوئے ہیں۔ اور ان دونوں سے دادِ سخن لی ہے +

انیس سے ملنا | واجد علی شاہ کی تخت نشینی کے ایک سال قبل یعنی ربیع الاول ۱۲۶۲ھ ہجری میں جناب صابر کا عقد فردوسی ہند جناب انیس مرحوم کی صاحبزادی کے ساتھ ہوا۔ جن کا انتقال رشید کے سامنے ہوا۔ انیس مرحوم ان صاحبزادی سے خصوصاً بہت محبت فرماتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جناب صابر بھی بہت محبوب تھے۔ جناب رشید فرماتے تھے کہ نانا جان مہینہ میں دو ایک مرتبہ والدہ کو دیکھنے ضرور تشریف لاتے تھے اور جناب انس مغفور کے ساتھ کھانا نوش فرماتے تھے۔ جتنے عرصہ تک قیام رہتا تھا ان دونوں بزرگوں میں فنِ شعر کے متعلق اس قدر دلچسپ اذکار ہوتے رہتے تھے گویا دو بلبل چہک رہے ہیں۔ خاندان کے نوجوان رشید، حمید، سعید، جدید وغیرہم حاشیہ نشین ہوتے تھے۔ اور اس دعوتِ علمی سے ذخیرۂ معلومات لے کر اٹھتے تھے۔

نقل | جناب حمید مرحوم فرماتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک جمعرات کو جناب نانا صاحب (یعنی جناب انیس) حسب معمول تشریف لائے۔ جناب دادا صاحب (یعنی جناب انس) سے گفتگو ہونے لگی۔ اثنائے کلام میں دادا صاحب نے جرأت مرحوم کا یہ شعر پڑھا۔

شعر

ہمارے سر پہ چھائی ہیں بلائیں شام ہجراں کی * وہ اپنے شغل میں ہیں بال دھو کے کھولے ادھر بیٹھے

نانا صاحب نے بہت تعریف کی۔ اور اپنے دونوں ہاتھ کانوں کے پاس لیجا کے اور چاروں انگلیوں کو یکے بعد دیگرے ایک دو رہی حرکت دے کے۔ دوسرے مصرعہ کو اس طریقہ سے ادا کیا۔ کہ اب تک وہ تصویر آنکھوں کے سامنے ہے۔ واقعی میر صاحب پڑھتے کیا تھے شعر کی تصویر کھینچتے تھے۔

معاش | جناب انس کے حالات میں لکھا جا چکا ہے کہ جب نواب ملکہ جہاں (زوجہ محمد علی شاہ)

کربلائے معلیٰ جانے لگیں۔ تو جناب محمد میرزا صاحب صابرؔ اپنے والد کے عہدہ کے ذمہ دار ہوئے۔ چند دنوں کے بعد جب میر انسؔ کا انتقال ہو گیا۔ تو یہی مختارِ عام ہو گئے اور پچاس روپیہ ماہانہ مقرر ہوئے۔

واجد علی شاہ اور جنابِ صابرؔ

عہدِ واجد علی شاہ میں جنابِ صابرؔ شاہی ملازم تھے یعنی مجرائیوں میں اسم تھا۔ میر صاحب کی شرافت و دیانت ذاتی نے اس قدر بادشاہ کے دل میں جگہ کر لی تھی کہ انھوں نے آخر کار اپنی بی بی زہرہ محل کے یہاں کی داروغگی اُن کے سپرد کر دی تھی۔

ایک روز جنابِ صابرؔ دربار میں حاضر تھے۔ بادشاہ نے اُن سے مخاطب ہو کے پوچھا "تم محمد میرزا انسؔ کے صاحبزادہ ہو"۔ انھیں نے جواب میں عرض کیا "جانِ عالم ہاں"۔ بادشاہ نے فرمایا "تم آئندہ اپنے کلام پر مجھ سے اصلاح لیا کرو"۔ بنا بر حکمِ ہمایوں۔ جنابِ صابرؔ نے چند غزلیں شاہ کو دکھائیں۔

یہ زمانہ لکھنؤ کی بہار کا تھا۔ ہر شخص بے فکر ہر طرف سامانِ عیش و طرب موجود۔ گلزارِ ارم سے خوش آیند نغموں کی صدائیں اٹھ اٹھ کے تمام خوش اوقات حلقوں میں اپنا دل کش اثر پھیلا چکی تھیں۔ اور النّاس علیٰ دین ملوکہم کا مفاد صرف بامحل تک پہنچ چکا تھا۔ ایسے مقامات پر جنابِ شعر کو جیسا رسوخ ہو سکتا ہے ظاہر ہے۔ فطرت سے لکھنؤ والے مجبور تھے۔ ورنہ اُس وقت کا ذوقِ شعر گوئی تو یہ کہتا تھا کہ اگر بس چلتا تو سارا لکھنؤ نظم میں باتیں کیا کرتا۔

زہرہ محل کو داروغہ کیا عطا ہوا تھا۔ ایک شاعر واجد علی شاہ کی طرف سے ملا تھا کہ زہرہ محل کی جانب سے نظمی چھیڑ چھاڑ ہوا کرے۔ اور اس طریقہ سے لطفِ محبت بھی نہیں کم حاصل ہو۔ چنانچہ جب جانِ عالم کی عدمِ تشریف آوری کو دو چار روز کا عرصہ گذر جایا کرتا تھا

تو اُدھر محل کی طرف سے ایک محبت نامہ (شکایت نامۂ معشوقانہ) نظم ہو کر جایا کرتا تھا۔
جو جناب صابرؔ نظم کیا کرتے تھے۔ مقتدر مکتوب الیہ کو معلوم تھا کہ صابرؔ نظم کرتے ہیں۔ لہذا
تبرکاً اُس پر اصلاح بھی دے دیتے تھے +

جب ۵ رجب ۱۲۷۲ھ میں واجد علی شاہ کو سرکار کمپنی نے کلکتہ روانہ کر دیا تو لکھنؤ
میں ایک انقلاب عظیم برپا ہو گیا جو سلطین شاہی کی حالتوں کا تغیر اور ملازمین بندگان عالی کا
تفکر میں کیا لکھ سکتا ہوں۔ صرف یہ کافی ہے کہ لکھنؤ کی روشن فضا میں تاریکی پھیل گئی۔ عیش و
عشرت کے ستارے دُھندلے ہو گئے۔ فراغت کا چاند غروب ہو گیا۔ خلاصہ یہ کہ جس کا
جدھر منہ اُٹھا اُدھر چلا گیا۔ واجد علی شاہ کے خاص وابستگانِ دولت اُن کے ہمراہ
کلکتہ چلے گئے۔ (فقیر اشہر کے پرنانا میر اسعادت خان داروغہ چاندی خانۂ شاہی بھی
ہمرکابِ پادشاہ رہے اور ماہ ذی الحجہ ۱۲۸۴ھ کلکتہ ہی میں انتقال کیا) +

قناعت اس مقام پر مجھ کو یہ ضرورت ہوئی کہ جنابِ صابرؔ کی قناعت کے متعلق کچھ لکھوں
کیونکہ یہ وقت اُن کے لیے بہت سخت تھا۔ واجد علی شاہ سے شفیق آقا سے جدائی ہو چکی تھی
غدر کی ہند سوز آگ نے بڑے بڑے خاندانوں کو برباد کر دیا تھا۔ خصوصاً دہلی اور لکھنؤ تو
خاص مرکزِ تباہی تھے۔ رؤسائے باقیماندہ کے پاس اس قدر سرمایہ خود نہ رہا تھا کہ اپنی ہی آبرو
قائم رکھتے۔ اور جن کے پاس تھا اُن سے کسی کو چنداں امید پرورش نہ تھی +

جنابِ صابرؔ کسی کے پاس نہ گئے۔ میر انیسؔ مغفور یا اُن کے والد ماجد میر اُنسؔ مرحوم
جو ماہانہ تنخواہ دیتے تھے۔ اُسی پر بسر اوقات تھی۔ اُن کو حالتِ عسرت میں دیکھ کر لوگوں نے
کہا۔ آپ ملازمت کیوں نہیں کرتے۔ جواب دیا حسبِ دل خواہ قدر دانوں کو کہاں سے لاؤں
ملازمت بہت دنوں کے بعد نواب ملکۂ جہاں کے یہاں اس وجہ سے سلسلہ ہو گیا تھا

کہ خود اُن کے والد بیگم صاحبہ کے نمک خوار تھے۔ دوسرے یہ کہ اگر اس ملازمت کو قبول نہ کرتے تو گویا جناب اُنس کی نافرمانی تھی۔ جس کو صابر ایسا صاحب استعداد اور فرماں بردار فرزند کبھی گوارا نہیں کر سکتا تھا۔

صابر کا سفر کلکتہ اور واجد علی شاہ سے ملاقات

ملکہ جہاں کی عدم موجودگی میں جس دیانت اور بیداری سے جناب صابر نے کام کیا تھا۔ اُس کے صلہ میں علاوہ اعتراف خدمت کے کافی صلہ بھی ملا تھا جس وقت ملکہ جہاں سفر عراق سے واپس آئیں تو کچھ تبرکات (جیسا عام قاعدہ ہے) اپنے ہمراہ لائیں۔ اور چاہا کہ واجد علی شاہ کے پاس بھی تحفتہً کچھ تبرک بھیجا جائے۔ اب یہ سوال پیدا ہوا کہ کس کے ہاتھ بھیجا جائے! یا تو جناب اُنس خود لے جائیں۔ یا چھوٹے داروغہ صاحب (جناب صابر) کو یہ خدمت سپرد ہو۔ ملکہ جہاں نے یہ طے کیا۔ کہ آخر الذکر کو یہ سربلندی بخشی جائے۔ چنانچہ جناب صابر تبرکات لیکے کلکتہ پہنچے۔ اُس زمانہ میں بادشاہ نقارخانہ واقع مٹیابرج میں تشریف فرما تھے۔ جناب صابر در دولت پر حاضر ہوئے چوبدار شاہی نے باادب عرض کیا "ظل اللہ فرستادۂ نواب ملکہ جہاں بیگم صاحبہ حاضر ہیں" ارشاد ہوا "بلالو" جناب صابر دربار میں گئے۔ مجرا بجالائے۔ فرمایا "بیٹھو" پہلی ہی نظر میں پہچان لیا۔ اور فرمایا "تم تو ہمارے نوکر تھے"۔ جناب صابر نے عرض کیا "جی جہاں پناہ"۔ پھر فرمایا "تم تو بالکل بڈھے ہوگئے"۔ عرض کی "جب حضور سا آقا سر پر نہ رہا تو جوانی کہاں"۔ اس عقیدت آمیز جواب نے شاہ کے دل پر اثر کیا۔ گردن جھکالی اور کئی منٹ تک خاموشی کا عالم طاری رہا۔

واجد علی شاہ کا سکوت

اس فقرہ نے واجد علی شاہ کے سامنے اُن کی عظمت کا پُرانا نقشہ پیش کر دیا۔ گویا وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ لکھنؤ ہے اور قیصر باغ کی بارہ دری پتھر منزل

پالگاہ ارم صد دربار گرم ہے۔ حاشیہ نشین اپنے اپنے اعزاز و مناصب کے مطابق شاہی مسند کے دونو پہلوؤں پر بیٹھے ہیں۔ درِ دولت کے پردوں سے اطمینان کی ہوائیں آرہی ہیں شغل سور و سرور جاری ہے۔ کہ ریزیڈنٹ یکایک دربار میں داخل ہوتا ہے اور کریچ کی سلامی دے کے ایک شقۂ سرکار کمپنی پیش کرتا ہے۔ جس میں ایک طویل عبارت نظر آتی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے۔

"معاہدۂ اشاعر کی پابندی آپ سے نہ ہو سکی۔ لہذا انتظام سلطنت اودھ خود کمپنی کرے گی۔ آپ کو اگر کچھ بطورِ عذر کہنا ہو تو کلکتہ پہنچ کر گورنر جنرل سے کہہ سکتے ہیں"

چہرہ کے مختلف تغیرات اور ایک عرصہ کے معنی خیز سکوت کے بعد بادشاہ نے گردن اُٹھائی۔ اور جناب صابر سے پوچھا" اب بھی کچھ کہتے ہو کہ عرض کیا" بالکل چھوڑ دیا" فرمایا" کیوں" عرض کیا" حضور کے تشریف لانے کے بعد جی نہ چاہا" جس کا جواب یہ ملا۔ کہ جناب صابر مشقِ سخن جاری رکھیں اور اصلاح کے لیے کلکتہ بھیج دیا کریں۔ اس کے بعد تبرکات کے حاضر کیے جانے کا حکم ہوا۔ تبرکات کے خوان پیش کیے گئے۔ بہت خوش ہوئے۔ دُرِ نجف کی تسبیح کو اُٹھا کے آنکھوں سے لگایا جناب صابر کو ایک بیش قیمت دوشالہ اور ایک رومال عطا ہوا +

عبادت | یہ معمول تھا کہ جناب صابر بلا ناغہ تین بجے رات سے اُٹھتے تھے۔ اور بعد نماز صبح تلاوت قرآن مجید اور وظائف میں آٹھ بجے تک مصروف رہتے تھے۔ خدا پرستی جیسی قناعت کے وسیع میدان میں ہو سکتی ہے۔ دولت کے بندے اکثر اُس سے نابلد ہیں +

جناب صاحب نے ۲۰ شوال روز چہارشنبہ ۱۳۱۱ھ بہتر سال کی عمر پاکر جانب ملکِ بقا رحلت کی +

مؤلف نے یہاں تک رشید کی دادھیال کے حالات لکھے۔ لہٰذا اب مختصراً نانہالی خاندان کو بھی بیان کر دیا جائے اگرچہ صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ رشید میر انیس کے نامی نواسہ ہیں۔ لیکن بہ مزید احتیاط کچھ نانہالی سلسلہ بھی حوالۂ قلم کیا جاتا ہے

رشید کی نانہال

رشید کے نانا ناخدائے سخن میر ببر علی انیس مغفور۔ بن میر مستحسن خلیق۔ بن میر حسن دہلوی تھے۔ جن کی مثنوی اور کلیات مشہورِ آفاق ہیں۔

میر حسن مرحوم نے اپنا خاندانی سلسلہ اپنے دیوان کے مقدمہ میں تحریر کیا ہے لہٰذا مختصراً (واقعات انیس سے لے کر) یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اُس سے زیادہ معتبر تحریر اس سلسلہ میں دوسری ممکن نہیں۔ وہ عبارت یہ ہے۔

"اما بعد بر سخن دانانِ شاطر و دانشورانِ ماہر مخفی نماند کہ اصل ایں مؤلف (میر حسن) ابن میر غلام حسین بن میر عزیز اللہ بن میر ہدایت اللہ بن میر امامی موسوی۔ از شاہجہاں آباد است۔ میر امامی موسوی در وقت شاہجہاں از ہرات آمدہ بہ منصب سہ ہزاری ذات بین الاقران ممتاز گردید۔ فاضل متبحر۔ وفقیہ بے مثل بودند۔ گاہ گاہ بجہت تفریح طبع فکر شعر ہم می نمودند۔ پس ایں عاجز سخن را شاعری اجداد و میراث نہ امروزی۔ الحمد للہ کہ ایں سلسلہ اللہ تعالیٰ با ایں ہمہ قدرتِ علم چوں طبع سامعان در خدمت سمع بلند نیافتند۔ بقدر حوصلہ آنہا بطرف ہزل توسنِ قلم راندند۔ بحکم آنکہ



حضرت رشید

امام رضا علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔

ملک

محق

میرا

بن

لهذ

سعت

نیافتند۔ بقدر حوصلہ آنفا بطرف بنزل توسن قلم راندند۔ بحکم آنکہ

زمانہ باتو نسازد تو بازمانہ بساز"۔ (رشید کو میر حسن علیہ الرحمہ سے منسوب کرنے کو اتنی عبارت کافی ہی۔)

رشید کی سسرال

جناب رشید کا عقد میر عسکری صاحب مرحوم کی دختر سے ہوا تھا۔ جو انیس مغفور کے منجھلے بیٹے تھے۔ اور اپنے والد ماجد ہی کے ساتھ رہتے تھے شعر و سخن سے کم دلچسپی تھی۔ اس وجہ سے غیر معروف ہیں +

پیارے صاحب رشید

نام و سال ولادت

آپ کا نام سید مصطفےٰ میرزا تھا۔ فرماتے تھے: "سال جلوس واجد علی شاہ میرا سالِ پیدائش ہی"۔ چونکہ تاریخ جلوس واجد علی شاہ روز دو شنبہ ۲۹ صفر ۱۲۶۳ھ ہی۔ لہذا یہی رشید کا سنِ ولادت ہی۔ صغر سنی میں خاندان کے بزرگ افرادِ محبت سے پیارے پیارے کہا کرتے تھے۔ اس لیے یہ عرف ہوگیا۔ کیا تعجب ہی کہ یہ لفظ پہلے میر انیس کی زبان سے نکلی ہو۔ اور انھیں کے اتباع میں اور لوگ بھی کہنے لگے ہوں۔ انیس کے تمام نواسے اور نواسیوں۔ اور پوتے پوتیوں میں رشید سب سے بڑے تھے۔ ظاہر ہی کہ پہلی اولاد کو انسان کس قدر محبت کی نگاہوں سے دیکھے گا۔

آپ کے والدِ ماجد کا نام سید احمد میرزا صاحب۔ بن سید محمد میرزا اُنس، بن سید علی میرزا، بن سید ذوالفقار علی میرزا ہی۔ اسی طرح سلسلۂ نسب امام رضا علیہ السلام تک پہنچتا ہی +

حُلیہ قد لانبا، بدن چھریرا، کمر نازک، ماتھا بلند، ستواں ناک، آنکھیں متوسط، پتلی میں کسی قدر نیلاہٹ، ہونٹ پتلے، رنگت گوری لیکن سُرخی غالب ہونے کی وجہ سے تیز گندمی رنگ کہا جاسکتا ہے۔ چہرہ پر بہت متانت تھی۔ داڑھی خشخشی سر پر پٹے +

یہ حُلیہ جناب رشید کی پیری کا ہے۔ اس سے اگر اُن کی حالتِ جوانی کا اندازہ کیا جائے تو کہا جاسکتا ہے۔ کہ جوان خوش گِل ہونگے۔ خود فرماتے تھے:: کہ جب غدر کی پریشانیوں کے باعث سے۔ میر انیس میرزا عباس صاحب کے مکان واقع منصور نگر میں۔ مع اہل و عیال چلے گئے تھے۔ تو میں بھی ساتھ تھا۔ بلوائیوں کی لوٹ مار جاری تھی۔ خاندان کے تمام مرد۔ اوقاتِ مقررہ پر روز و شب باری باری پہرہ دیتے تھے۔ میری کمر میں بھی سبز منڈ کی بندھی ہوئی تھی:: خلاصہ یہ کہ رشید بھی کبھی لکھنؤ کے بانکے جوان ہونگے +

وضع و لباس — آخر عمر کی وضع بالکل سادی تھی۔ مہین تنزیب کا انگرکھا پہنتے تھے۔ اُس کے نیچے کرتہ نہیں ہوتا تھا۔ البتہ کبھی کبھی جامانین کا شلوکہ کہنیوں تک کا پہن لیتے تھے۔ دو پلڑی ٹوپی چکن کے کام کی پہنتے تھے۔ پنج گوشیہ ٹوپی جو اکثر مرثیہ خواں پہنتے ہیں۔ آپ نے کبھی نہیں پہنی۔ یہی دو پلڑی ٹوپی اُن کا خاندان بھر پہنتا ہے۔ اب تک انیس کے خاندان والے پنج گوشیہ ٹوپی پہن کر زیبِ ممبر ہوتے تھے۔ اور عشق کے خاندانی دو پلڑی ٹوپی پہن کے۔ یہی امتیازی فرق سرِ ممبر خاندانی سلسلہ ظاہر کرتا تھا۔ (لیکن سوائے بڈھوں کے پنج گوشیہ ٹوپی کا رواج اُٹھ گیا) رشید نے جوانی میں بھی گھٹنا نہیں پہنا۔ کلی دار پاجامہ

پہنتے تھے۔ جب زیبِ منبر ہوتے تھے۔ تو ایک بڑا رومال دونوں زانوؤں پر ڈال لیتے تھے جس کو تہذیب منبر کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہی۔

استعداد علمی | یوں تو جنابِ رشید نے بہت سے باکمالوں سے درس لیا ہی۔ لیکن یہ چند حضرات قابلِ ذکر ہیں۔

مولوی سید اصغر شاہ صاحب سے صرف و نحو کی کتابیں پڑھیں۔ مولانا میرزا محمد صاحب اخباری سے جو لکھنؤ کے ممتاز علما میں سے تھے۔ فقہ کی کتابیں ختم کیں۔ اسی سلسلہ میں۔ مولوی محمد تقی صاحب نے جنابِ رشید سے سوال کیا کہ آپ نے اصولِ فقہ اُن سے نہیں پڑھے ؟ ہنس کے فرمایا: "اصول فقہ سے اُن کو کیا علاقہ تھا"۔ (اُستاد کے عقائد کا اثر شاگرد پر ضرور پڑتا ہی۔ اگرچہ کافی اثر نہ ہو تو کم از کم اُس کے خیالات کی وقعت ضرور ہوتی ہی۔) منطق و فلسفہ مولوی انور علی صاحب حنفی سے پڑھا تھا۔ خلاصہ یہ کہ عربی کے درسیات کل نکلے ہوئے تھے۔ فارسی میں بہت اچھا ملکہ رکھتے تھے۔

رشید کو رَل میں بھی کچھ دستگاہ تھی۔ اکثر لوگ دریافت حال کرنے آتے تھے۔ مگر پیرانہ سالی میں انکار کر دیتے تھے۔ تاہم اب بھی علی الصباح عورتیں اپنے بچوں کو لیے ہوئے آتی تھیں۔ اور اکثر مختلف امراض کے تعویذ لے جایا کرتی تھیں خصوصاً اگر کوئی مریض کُرل میں مبتلا ہوتا تھا۔ تو جنابِ رشید کا صرف تین روز پڑھ کر گلے پر ہاتھ پھیر دینا شفا بخشتا تھا۔ اُن کے بعد کُرل کی شکایت رکھنے والے حمید و سعید کے پاس آتے تھے۔ اور شفا پاتے تھے۔ رشید کی استعداد علمی کی تائید میں۔ ذیل کی دو سطریں جنابِ محشر کی زبانی نقل کی جاتی ہیں۔

"میر وزیر علی دلگیر مرحوم ساکن گولا گنج لکھنؤ رشید کے بے تکلف اور
ہم سن دوست تھے۔ دورانِ گفتگو میں ایک روز جناب مخبر سے فرمانے
لگے: "لکھنؤ کے لوگ رشید کی استعداد علمی میں شک کرتے ہیں۔ بھائی
یہ بالکل غلط ہے۔ میں اور رشید شمس بازغہ ساتھ پڑھتے تھے۔"

فقیر مؤلف اکثر خدمتِ رشید میں جایا کرتا تھا۔ بیشتر نمازِ مغرب کے وقت۔ اپنے
دادا کی مسجد میں ملا کرتے تھے۔ ایک روز میں حاضر تھا۔ اتفاق سے ایک بلوچی سائل نے
مسجد کے دروازہ پر آکر سوال کیا: "برائے خدا چیزے بدھید" رشید نے اُس سے
فارسی میں باتیں کرنا شروع کر دیں۔ تھوڑی دیر کے بعد میری طرف متوجہ ہوئے
اور فرمایا: "فارسی بڑی میٹھی زبان ہے"۔ اسی طرح ایک مرتبہ میں نے جناب مولانا محمد حسین
صاحب قبلہ علامہ ہندی مرحوم سے عربی میں باتیں کرتے سُنا تھا۔ مجھ کو اُس وقت تک
علم نہ تھا کہ رشید عربی بھی پڑھے ہیں۔ میں نے استعجاباً مولانائے مرحوم سے پوچھا:
"کیا رشید عربی بھی پڑھے ہیں؟" فرمایا: "وہ کیا نہیں پڑھے ہیں"۔

لکھنؤ کے مشہور طبیب حکیم باقر حسین صاحب مرحوم۔ اور مولوی سید جواد صاحب وغیرہم
رشید کے ہم درس اور بے تکلف دوست تھے۔

اخلاق و مزاج

رشید کا خلق بہت وسیع تھا۔ جس کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ آج زمانہ
مداح ہے۔ چونکہ خود فقیرانہ مزاج رکھتے تھے۔ لہٰذا جہاں تک ہو سکتا تھا۔ دوسرے
کے احساسات کو صدمہ نہیں پہنچاتے تھے۔ کسی سے اگر ایک دفعہ ملاقات ہو گئی اُس
کے بعد جب کبھی اُس سے ملاقات ہوتی۔ وہی تپاک۔ وہی اخلاق۔ کیوں نہ ہو پُرانے
زمانہ کے ممتاز افراد کی صحبتیں اُٹھا چکے تھے۔ بلکہ خود بھی اُنہیں کا ایک آخری جزو

تصور کیے جاتے تھے۔ اگر وہ پابندی وضع نہ کرتے تو اور کون کرتا +

نقل

جس زمانہ میں جناب محشر کا قیام کوچۂ شاہ چھبڑا میں تھا۔ یہ سخت بیمار ہوئے اور جس روز بعد صحت گھر سے باہر نکلے۔ اُسی روز اُن کی عدم موجودگی میں جناب رشید عیادت کو تشریف لائے۔ جناب محشر گھر میں کہاں تھے جو ملتے۔ رشید نے کاغذ اور قلم دوات منگوائی۔ خادمہ نے پنسل کاغذ حاضر کیا۔ اُس سے فرمایا "تو اہم لوگ اگلے وقت کے ہیں۔ ابھی تک نہ پنسل سے لکھا ہے۔ نہ لکھنا آتا ہے۔ قلم دوات لاؤ" غرض کہ قلم دوات آئی۔ اور رشید یہ شعر لکھ کر واپس گئے۔

رکاب گنج سے مشتاق و بدر آیا تھا
ملے نہ حضرتِ محشر رشید آیا تھا

"جناب عزیز تحریر فرماتے ہیں۔ میں اپنی بدبختی سے بہت کم اُن کی خدمت میں جاتا تھا۔ مگر جب ملاقات ہوتی تھی۔ تو یگانگی و محبت اُن کے لفظ لفظ سے ٹپکتی تھی۔ مجالس میں جب سر منبر معروف مرثیہ خوانی ہوتے تھے۔ اور مجھ پر نظر پڑ جاتی تھی۔ تو اکثر مرثیہ روک کر اپنے قریب بلا لیتے تھے۔ اور یہ اُنکی عزت افزائی تھی۔ مرحوم کا انکسار اور ہضم نفس اس قدر بڑھا ہوا تھا۔ کہ بعض وقت اُن کے چھوٹوں کو یہ دھوکا ہوتا تھا کہ یہ ہمیں بنائے تو نہیں ہیں۔ مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا تھا"

اوقاتِ ملاقات — رشید کی ملاقات کا یہ طریقہ تھا۔ اگر کوئی اوقاتِ نماز کے وقت پہنچا تو مسجد میں ملتے تھے۔ اور چٹائی بچھوا دیتے تھے۔ اور مہمان کے ساتھ خود بھی بیٹھ جاتے تھے۔ باتیں کرنے لگتے تھے۔ سننے والا اس بلبل قند مقال کی نواسنجیوں سے مست ہو جاتا تھا

اگر کوئی اوقاتِ نماز کے علاوہ کسی وقت پہنچا۔ تو امام باڑہ کے مشرقی کمرہ میں تشریف فرما ہوتے تھے۔ جہاں صرف اتنا سامان تکلف نظر آتا تھا۔ کہ ایک سفید فرش ہوتا تھا اور اس پر اگر جاڑوں کا زمانہ ہوا تو روئی دار کنٹوپ اور دگلا۔ اگر گرمیاں ہوئیں تو ایک کرتہ اور لنگی باندھے ہوئے۔ اللہ اللہ خیر صلاح۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے اسد

زینتِ دنیوی سے پرہیز

اکثر اعزا و احباب نے کہا۔ آج کل ہر شخص شانِ ظاہری کا پابند ہے۔ اور بغیر اُس کے چارہ نہیں۔ آپ کے پاس معززین آتے ہیں۔ اُن کے لیے ایک کمرہ مع سامان علیحدہ ہونا چاہیے۔ جس سے اُن کی نگاہوں میں آپ کی وقعت اور زیادہ ہو۔ جواب دیا۔ "بس یہی ٹھیک ہے رشید بدل نہیں سکتا"۔

نازک مزاجی اور اہلِ کمال

آخری وقت میں بہت نازک مزاج ہو گئے تھے۔ اول تو پیرانہ سالی، دوسرے دُنیائے مرثیہ گوئی کے چند ناگوار و ناگفتہ بہ واقعات ایسے گزرے جنہوں نے رشید کو زُود رنج بنا دیا تھا۔ اگرچہ کمال کے لیے نازک مزاجی لازم ہے۔ لیکن ہر سخن موقعہ و ہر نکتہ مقامے دارد۔

یہ ضرور ہے کہ ایک کامل شخص جو دُنیا کو اچھی طرح دیکھ چکا ہو۔ اُس کے نشیب و فراز سے اچھی طرح آگاہی حاصل کر چکا ہو۔ شہرت کی آخری حد تک پہنچ چکا ہو۔ اُس کی طبیعت میں ایک قسم کا استغنا پیدا ہو جاتا ہے۔ جس سے عوام کی نظر غرور مراد لیتی ہے۔ مگر حقیقتاً ایسا نہیں ہوتا۔ وہ تمدنی نقطۂ نظر سے باہمی تعلقات کو برقرار رکھنے پر فطرتاً مجبور رہتا ہے۔ مگر اُس کا طرزِ عمل خودداری اور بے پروائی کے نمایاں رنگ میں ڈوبا نظر آتا ہے۔ اخلاق ایک جوہرِ انسانی ہے۔ یا وہ زیور ہے۔ جس کے سوا کسی دوسری چیز سے انسان کی

آراستگی غیر ممکن۔ دُنیا کا کوئی مذہب اخلاقی مواعظ کی تلقین سے خالی نظر نہیں آتا۔ اور مذہب اسلام کی تو بُنیاد ہی اخلاق پر ہے۔

میری رائے میں کسی کو کیسا ہی کمال کیوں نہو۔ مگر اُس کو اپنے اخلاق کو نہ بگاڑنا چاہیے۔ اظہارِ اخلاق کا قدرتی آلہ زبان ہے۔ لہذا دوسرے سے جب گفتگو کی جائے تو ایسے الفاظ میں جن سے عمدگیِ اخلاق کا پتہ چلے۔

مبالغہ آمیز واقعہ — مؤلف واقعات انیس نے صفحہ ۱۲۱ پر انیس مغفور کے متعلق ایک واقعہ لکھا ہے۔ جو مختصراً درج ذیل ہے۔

خود انیس مغفور نے ایک زمانہ تک لکھنؤ میں مرثیہ پڑھنا ترک کر دیا تھا۔ مگر ایک مدت کے بعد چند مجبوریوں سے حسینیہ افضل محل مرحومہ میں ایک مجلس پڑھی۔ جو مرثیہ پڑھا تھا اُس کا مطلع یہ ہے ؎

جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے

لوگوں کو کسی طرح یہ معلوم ہوا۔ کہ اس مرثیہ کا نصف حصہ میر صاحب نے ایک شب میں تصنیف کیا تھا۔ اتفاقاً اسی سلسلہ میں انیس کی زُود گوئی کا ذکر نواب محمد حسین خاں صاحب مرحوم کی صحبت میں بھی آگیا۔ جس میں میر نواب صاحب مونس بھی موجود تھے انھوں نے اپنے جادو نگار بھائی کی عظمت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کہا "مشاقوں کے نزدیک ایک شب میں سو پچاس بند مرثیہ کے کہہ لینا کچھ حیرت انگیز بات نہیں ہے"

لوگوں نے یہ واقعہ انیس کے گوش گذار کیا۔ اور نہ معلوم کن الفاظ میں کہ انیس ناراض ہو گئے۔

بالمختصر۔ مونس مرحوم جب اپنا مرثیہ اصلاح لینے کے لیے انیس کے پاس حاضر ہوئے

جس کا مطلع یہ ہی۔ (نہ معلوم اصلی مرثیہ کا یہی مطلع تھا یا کچھ اور)

مجلس افروز ہی مذکورِ وفاداری حُر،

میر انیس اُس وقت حوض میں نہار ہے تھے۔ مونس کی صورت دیکھ کے کچھ یاد آگیا۔ فرمایا پڑھو۔ سُنتے رہے۔ اور جب مرثیہ ختم ہوا۔ تو ایک دفعہ اپنے ہاتھ میں لے کر اُس کے سیاہ ورقوں کو حوض کے شفاف پانی میں سفید کر دیا۔ اب حوض سے نکلے اور مونس کو اپنے ساتھ لیے ہوئے گھر پہنچے۔ اور جنابِ مونس کو وہ فقرہ یاد دلایا۔ جو اُنھوں نے نواب محمد حسین خاں صاحب کی محفل میں کہا تھا۔ اور غیظ میں کہا۔

"میر نواب یاد رکھنا اگر تمہاری تعلیّوں کی یہی کیفیت رہی تو خورشید علی کی جوتیاں ہونگی اور تمہارا سر"!

تقاضائے انصاف

میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ قابل مؤلف نے۔ انیس کی زود رنجی۔ اور نازک مزاجی کے اظہار کے لیے یہ نقل لکھی ہی۔ یا مونس مرحوم کا اظہارِ سعادت اس سے مقصود ہی بہر حال یہ تو ظاہر ہو گیا کہ۔ انیس۔ مونس۔ نفیس۔ تین فکروں نے مل کر ایک وقت میں ایک مرثیہ تیار کیا۔ اور شاید پوری نقل کا نتیجہ بھی مؤلف کے نزدیک یہی تھا۔ مگر غائر نظر ڈالنے والوں نے۔ اُس سے ایک نتیجہ اور بھی نکالا ہی۔ اور وہ یہ کہ انیس کے اخلاق۔ اس قدر کمزور تھے۔ کہ نازک مزاجی نے اُن کو مغلوب کر لیا تھا۔ اول تو ایک برابر کا بھائی۔ اور کیسا بھائی۔ جس کا کمال۔ انیس کے کمال کا جزو قوی ہو۔ دوسرے جس کی شخصیت اہلِ علم کی نگاہوں میں ایک پایہ حاصل کر چکی ہو۔ اُس کو انیس ایسا بھائی ایسے مکروہ الفاظ سے مخاطب کرے۔ اور پھر خلوت میں بھی نہیں۔ بلکہ ایک نوعمر فرزند یعنی نفیس مرحوم کے سامنے۔ یہ فعل انیس کی ناعاقبت اندیشی پر محمول ہو سکتا ہی

اگر نفیس سا مرتبہ شناس فرزند نہوتا۔ تو احتمال تھا کہ اپنے ایک بزرگ خاندان کو اپنی آئندہ عمر میں کوتاہ نظری سے دیکھتا۔

علاوہ بریں انیس مرحوم نے اُس مرثیہ مشہور میں جس کا مطلع یہ ہی

"نمک خوانِ تکلم ہی فصاحت میری"

تفاخرِ شاعرانہ کرتے ہوے اپنے اعزائے باکمال کا ذکر کیا ہی۔ چنانچہ مونس مغفور کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں۔

بھائی وہ مونسِ خوش لہجہ و پاکیزہ خیال جس کا سینہ ہنرِ علم سے ہی مالامال

یہ فصاحت یہ بلاغت یہ سلاست یہ کمال معجزہ گر نہ اسے کہیئے تو ہی سحرِ حلال

اپنے موقع پہ جسے دیکھیئے لاثانی ہی

لطف حضرت کا یہ ہی رحمتِ ربانی ہی

طبعِ سلیم اس واقعہ کو ہرگز ہرگز نہیں تسلیم کر سکتی۔ اصحابِ تہذیب سے یہ امر بالکل بعید ہی۔ بفرضِ محال اگر انیس نے ایسا کہا بھی تھا۔ تو اس واقعہ کو پبلک میں پیش کرنے کی ہرگز ضرورت نہ تھی۔ یہ واقعہ اُن انسانی کمزوریوں کی شق میں آتا ہی جو کسی فردِ کامل کے حالاتِ زندگی لکھتے وقت قلم کو نظر انداز کرنا چاہیئے۔

مذہب | بعض تذکرہ نویسوں نے نہیں معلوم شاعروں کے مذہب سے کیوں بحث نہیں کی ہی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ان لوگوں نے اس میں کیا مصلحت رکھی ہی۔ سب سے زیادہ تعجب مولانا شبلی مرحوم پر ہی۔ جو اس دورِ جدید کے مشہور انشا پردازوں میں سے تھے۔ اور یورپ کے طرزِ تحریر سے اُن کے قلم کو خاص لگاؤ تھا۔ انھوں نے بھی شعر العجم میں شاعر کے مذہب سے بحث نہیں کی۔ البتہ شاذ کسی کے عقائد کو مجملاً

بیان کردیا ہے۔

بہرحال جس شخص کے حالات تصریحاً لکھے جائیں۔ اُس کے مذہب پر بھی پوری روشنی ڈالنی چاہیے۔ تاکہ آئندہ نسلیں اُس کے متعلق تاریکی میں نہ رہیں۔ اور قلمی فساد پیدا نہو۔ مولوی الطاف حسین حالی مرحوم نے۔ غالب کے باب میں کس قدر لکھیڑا کیا ہے۔ حتیٰ کہ اُن کو کھینچ تان کر تفضیلیہ ثابت کردیا۔ اگرچہ تھوڑی دیر کو فرض کرلیا جائے کہ غالب سُنی تھے۔ تو مذہب تشیع میں کونسا ضعف پیدا ہوتا ہے۔ اگر شیعہ تھے تو مذہب سُنن میں کونسی کمزوری آئی جاتی ہے۔ بہرحال غالب شیعہ تھے۔

جناب صفیر بلگرامی۔ شاگرد جناب غالب۔ و مرزا دبیر۔ و سحر لکھنوی اپنے تذکرہ جلوۂ خضر میں لکھتے ہیں۔ (میں پوری عبارت نقل نہ کروں گا۔ بلکہ مناسب مقام)

"بندہ ۱۲۸۱ھ میں اپنے نانا حضرت صاحب عالم سجادہ نشین مارہرہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہاں حضرت غالب کا ذکر آیا۔ نانا صاحب سے اور اُن سے ایک خاص ربط تھا۔ میں نے خواہش کی کہ غالب کا شاگرد ہوں۔ نانا صاحب نے ایک عریضہ مع دو غزلوں کے ارسال خدمت غالب کیا۔ ۱۲۸۲ھ میں حضرت غالب کی زیارت کا اشتیاق ہوا۔ آرہ سے مارہرہ پہنچا۔ اور وہاں سے اپنے منجھلے ماموں حضرت شاہ عالم کے ساتھ دہلی روانہ ہوا۔ بلی ماروں کے محلہ میں حضرت غالب کے پاس پہنچا۔ مجھ کو پوچھا یہ کون ہیں۔ میرے ماموں نے کہا۔ "صفیر آپ کے شاگرد"۔ اتنے میں نواب ضیاءالدین خان صاحب تشریف لائے۔ اور دوسری باتیں چھڑ گئیں +

ہم کو اور ماموں صاحب کو نواب صاحب موصوف کے مکان میں
قیام کی جگہ ملی۔ جو مسجد جامع کے متصل تھا۔ ایک دن ہم اور ماموں صاحب
اور چند دوسرے حضرات غالب کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے۔
اثنائے کلام میں ایک صاحب نے میرے مذہب کو دریافت کیا۔
غالب نے میرے ماموں کی طرف اشارہ کرکے کہا مِنھُم اور میری
جانب اشارہ کرکے کہا مِنّا۔ یعنی میرے ماموں کو کہا کہ سُنّی ہیں۔
اور مجھ کو کہا کہ یہ ہم میں سے ہیں۔ یعنی شیعہ ہیں"

دیکھیے حافظ شیرازی کی نسبت کیسا جھگڑا پڑا ہوا ہے۔ شیعی کہتے ہیں شیعہ تھے۔ اور
اُن کا قصیدہ اس کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔ اہلِ تسنن انھیں سُنّی کہتے ہیں
اور قصیدہ کو الحاقی بتاتے ہیں۔

محقق دوانی کی نسبت بھی یہی جھگڑا ہے۔ شیعہ اُن کی نسبت کہتے ہیں۔ کہ آخر زمانہ
میں وہ شیعہ ہو گئے تھے۔ اور رسالۂ نور الہدایۂ علامۂ دوانی کو حجت میں پیش کرتے
ہیں۔ غرضکہ اگر مذہب تحقیق کرکے لکھ دیا جائے۔ تو آئندہ نسلوں میں اس قسم کا
جھگڑا پیدا نہو۔

بہرحال جنابِ رشید کا مذہب شیعہ تھا۔ لیکن تعصبِ مذہبی اُن کو مطلق
نہ تھا۔ اُن کے تمام مراثی اس امر کے ثبوت کے لیے کافی ہیں۔ سُنّی و شیعہ کے مابہ النزاع
مسائل کا اُن کے کسی صنف کے کلام میں ذرا ذکر نہیں۔ حیدر آباد۔ پٹنہ۔ کلکتہ اور
لکھنؤ کی مجالس میں ایک معتدبہ تعداد اہلِ سُنّت کی ہوتی تھی۔ مگر کبھی کسی نے مرثیہ کے
کسی حصہ میں کوئی مقام اپنے اعتقاد کے خلاف نہ پایا۔

ظاہر ہی کہ صنفِ سخن میں مرثیہ وہ صنف ہی جس میں سوائے حالات متعلقہ کے کسی دوسرے مضمون کی گنجائش ہی نہیں۔ قادر الکلامی کے تو یہی معنی ہیں کہ شاعر جس صنف کو اختیار کرے۔ اُس کے دائرے سے آگے قدم نہ نکالے۔

مرثیہ کا میدان اوّل تو یوں ہی وسیع ہی۔ دوسرے یہ کہ فضائل و حالات شہدائے کربلا اس قدر وسیع ہیں کہ آج تک لکھے جاتے ہیں۔ اور ختم نہیں ہوتے۔

اسی طرح انیس و دبیر نے بھی مذہبی مسائل سے اپنے مراثی میں گریز کی ہی چنانچہ ایک مرتبہ ماہِ رمضان میں مکرمی جناب نواب بن صاحب تیغ کے مکان پر وقت افطار میں بھی موجود تھا۔ ایک صاحب ضعیف العمر مرزا احمد جعفر صاحب بھی موجود تھے۔ جو مرزا دبیر مغفور کے شاگرد ہیں۔ اور جن کے پاس اُن مرحوم کے کلام کا بیشتر حصّہ موجود ہی۔ اثنائے کلام میں مرزا دبیر مغفور کا ذکر نکل آیا۔ اور اتفاق سے مرثیہ کے اُس طرز پر گفتگو ہونے لگی جس سے کسی گروہ کی دلشکنی نہو۔ مرزا صاحب موصوف نے بیان کیا۔ کہ پٹنہ میں ایک دفعہ دبیر مغفور سے لوگوں نے اصرار کیا۔ کہ کچھ رباعیات خلاف شان مرثیہ نظم کریں۔ اور پڑھیں۔ اوّل تو مرزا صاحب نے بہت انکار کیا۔ مگر جب لوگوں نے نہ مانا تو ناچار دو رباعیاں کہیں۔ جن کے چوتھے مصرعہ میں نعمت خاں عالی کے دو قطعوں کے آخری مصرعوں کا بعینہٖ ترجمہ کر دیا ہی۔

مشہور ہی کہ عالمگیر کے بارہا استفسارِ مذہب پر نعمت خاں عالی نے جواب پیچیدہ دیا تھا۔ اُن قطعات کے مطلب میں دو نو پہلو ہیں۔ اگر چار کی تکرار کو متعدد دیا جائے تو مذہب اہلسنّت کی پیروی معلوم ہوتی ہی۔ اگر چار کو تین سے ضرب دے کے جمع کریں تو مذہب اثنا عشری کا ماننا ثابت ہوتا ہی۔ ذیل میں عالی اور دبیر دونوں کے

اشعار پیش کش ہیں۔

عالی

بار ہا گفتستم بتو اے شہریار
چار یارم۔ چار یارم۔ چار یار

مرزا دبیر

گو قائلِ چار یار اغیار ہوئے
پوچھیں جو نبی کے جانشینوں کو دبیر
ہم اُن کے شریک چار و ناچار ہوئے
کہہ۔ چار ہوئے۔ چار ہوئے۔ چار ہوئے

عالی

اصحابِ نبی کہ چار یار اند
در پاکیِ شاں شکے نہ رہے
چوں چار کتاب در شمار اند
زاں چار یکے نداشت عیبے

دبیر

افضل ہیں نبی کے یار سب یاروں میں
کچھ اس میں شک و پیچ نہیں ہم کو دبیر
چیدہ ہیں یہ چار لاکھ دینداروں میں
اک طالبِ دُنیا نہیں ان چاروں میں

یہ رباعیاں مثالاً اس وجہ سے لکھ دی گئیں۔ کہ ان میں کوئی امر خلافِ مذہب نہیں ہے جو کسی کو ناگوار گذرے۔ جو نکتہ اس میں رکھا گیا ہے وہ ظاہر ہے۔ اور دُنیا مذہبِ اثنا عشری کے عقائد کو جانتی ہے۔ بہر حال رباعیات پُر لطف ہیں۔ بہ حیثیتِ کلام۔

تقریر و تحریر

رشید کی گفتگو کا طریقہ نہایت دلچسپ تھا۔ اول تو اُن کی سلیس زبان دوسرے نرم لہجہ۔ یہ دونو باتیں ایسی تھیں جو سُننے والے کو محو کر دیتی تھیں جواب نہایت نرم اور مختصر الفاظ میں دیتے تھے۔ جب مولوی محمد تقی صاحب شادماں نے اُن کے حالات قلمبند کرنا شروع کیے تو دوسرے تیسرے رکاب گنج جایا کرتے تھے اور خود جناب رشید یا جنابِ حمید سے استفسار حالات کرتے تھے۔ ایک مرتبہ

مولوی صاحب موصوف نے جناب رشید سے اُن کے کلام کے انتخاب کے بارہ میں گفتگو چھیڑ دی۔ اور کہا کہ فلاں مرثیہ دیکھئے۔ اور فلاں سلام دیکھیے۔ اور ہاں وہ رباعیات بھی مرحمت فرمایئے جو حضور نظام کی مدح میں ہیں۔ اور دیکھیے اپنی رباعیوں کا مجموعہ بھی نکال رکھیے گا۔ بھولیے گا نہیں۔ جناب رشید نے ان سب باتوں کا جواب اس مختصر جملہ سے دیا۔ "بھئی میں اپنا بستہ لائے دیتا ہوں۔ مگر لیتے جاؤ۔ جو جی چاہے نکال لینا"۔ لفظ "بھئی" تو اُن کی زبان سے ایسی پیاری معلوم ہوتی تھی۔ کہ گویا اُنھیں کے لیے وضع ہوئی تھی۔ سرِ منبر بھی جس بند پر سامعین کی زیادہ توجہ چاہتے تھے۔ تو کہتے تھے "بھئی سنو" اور کبھی کبھی کسی مصرعہ کے پہلے اُس کو استعمال کرتے تھے۔ تو معلوم ہوتا تھا۔ کہ جزوِ مصرعہ ہی ہے۔

لطیفہ

شدید گرمیوں میں ایک مرتبہ جناب محشر ملنے گئے۔ باتیں ہونے لگیں۔ اثنائے گفتگو میں مرحوم نے عرقِ پیشانی رومال سے پاک کیا۔ اور مسکرا کر فرمایا "محشر! دیکھتے کیا ہو۔ یہ پسینہ نہیں ہے۔ دماغ سے مضامین کا جوہر کھنچ رہا ہے میں نے رومال میں اس وقت حفاظت سے باندھ لیا ہے۔ جب ضرورتِ نظم ہوگی دیکھا جائے گا"

اگر کسی کو خط لکھتے تھے تو بہت مختصر اور مطلب خیز +

خودداری | جہاں یہ سب تھا۔ وہاں رشید میں صفتِ خودداری بھی بہت تھی۔ زیادہ خودنمائی اگرچہ کسی حد تک ہو۔ اور وہ صحیح ہی کیوں نہو۔ دوسروں کی نظروں میں زوالِ وقعت کا باعث ہوجایا کرتی ہے۔ واضعانِ قانونِ تمدن و اخلاق نے جو

اصول تہذیب مجلس کی صنف میں قائم کیے ہیں۔ اُن کی پابندی اگر کچھ اور نہیں تو انسان کو
خود شناسی اور غیر شناسی کے سچے راستہ پر ڈال دیتی ہے۔ مگر یہ نتیجہ اُس وقت نکلتا ہے
جب اصولِ تہذیب مجلس کی پابندی میں رسم زمانہ یا دکھاوٹ کا شائبہ مطلق نہو۔
کیونکہ جہاں غرضِ اصلی مفقود ہوگی۔ پابندی تہذیب مضحک ہوجائے گی۔ اور جہاں
مدعائے حقیقی مدِ نظر ہوگا۔ رُوح کو فرحت حاصل ہوگی۔

جو اصحاب ان اصولوں کے منشاء اصلی سے بیگانہ ہیں۔ وہ اُن کو محض تکلف
سمجھ کے ہنستے ہیں۔ مگر وہ حضرات شاید یہ نہیں سوچتے۔ کہ اگر اس تکلف کو درمیان
سے نکال دیا جائے۔ تو جو افراد مستحق عزت ہیں۔ اور جو نہیں ہیں وہ دونوں ایک ہی
سطح پر آئے جاتے ہیں۔ اور جس کا آخری نتیجہ یہ نکلتا ہے۔ کہ فضلا و جہلا۔ امرا و غیر امرا
سب ایک ہی برتاؤ کے قابل ہیں۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ میں اس بحث کو طولانی کرنے
میں مطلب سے دُور نکل جاؤں گا۔ لہذا یہ کہہ کے ختم کرتا ہوں۔ کہ اصولِ تہذیب کی
پابندی ہر مذہب میں اُس کے رہنماؤں کی سچی پیروی ہے۔

اے یورپ کی تہذیب کے دلدادہ نوجوانو اپنے آباؤ اجداد کے اوضاع پر
پہلے ایک نظر ڈال لو پھر جو جی چاہے کرو! +

صنف خاموشی

رشید میں چونکہ زیادہ گوئی بالکل نہ تھی۔ اس وجہ سے جو جملہ مُنہ سے
نکلتا تھا۔ مناسب محل ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک صاحبِ دولت رشید کے
پاس تشریف لائے۔ چونکہ خود بھی شاعر تھے۔ ایک مطلا بیاض ایک مصاحب کے
ساتھ تھی۔ اُن کی تشریف آوری کی غرض رشید کو اپنا کلام سُنانا تھا۔ اور بس۔
بعد رسمِ ملاقات اُن حضرت نے اجازت رشید لے کے بیاض کھولی۔

رشید سُننے کے لیے متوجہ ہوئے۔ بیچارہ کی زبان سے پورا مصرعہ بھی نہ نکلنے پایا تھا
کہ مصاحبین نے جو اُن کے ہمراہ تھے۔ ہا۔ ہا۔ ہا سبحان اللہ کی صدائیں۔ بلند کرنی شروع
کردیں۔ اسی طرح وہ حضرت چار پانچ شعر پڑھ گئے۔ رشید صرف گردن ہلاتے رہے
مگر ان کی خاموشی کی اُن کو تاب نہ رہی اور کہا۔ جناب آپ کچھ نہیں بولتے۔ فرمایا "حضرت
جہاں تعریف کرنے والے موجود ہوں وہاں رشید کے بولنے کا کیا محل" اس پر
سب خاموش ہوگئے۔ اور اب رشید نے اُن کے کلام کی برمحل داد دینا شروع
کی۔ وہ حضرت بہت خوش ہوئے۔ اور بیاض رشید کے پاس اصلاح کی غرض سے چھوڑ گئے

رشید اور آلا اودل

رشید کے مکان کی پشت پر ایک وسیع زمین پڑی ہی جس پر کاشت
ہوتی ہی۔ اور چند مکان بنے ہیں۔ جن میں مزدوری پیشہ قومیں آباد ہیں۔ یہ لوگ
دن بھر کے تھکے ماندے رات کے وقت اپنے اپنے جھونپڑوں میں بے فکری سے
اوقات گذاری کرتے ہیں۔ اور اُن کی دوسری دلچسپی کے اشغال ہیں۔ ایک آلا اودل
پڑھا جانا بھی ہی۔ چنانچہ حمید مرحوم کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ ادھر آلا اودل شروع ہوئی
اور جناب رشید کھیت کی مینڈھ پر جا بیٹھے۔ اکثر ایسا ہوا ہی کہ رات کے دو بجے
اٹھ کر گھر آئے۔ رشید کو اُس سے غیر معمولی دلچسپی کی وجہ یہ تھی کہ یہ ہندی کی
نظم رزمیہ ہی۔ اور اس قدر سادہ ہی کہ یورپ کی نیچرل شاعری کا جواب دیتی ہی۔ چونکہ
رشید کو مرثیہ میں مضامین رزمیہ سے کام پڑتا تھا۔ اس وجہ سے آلا اودل کی
واقعہ نگاری اور سادگی بہت پسند آتی تھی۔ اور اُس کی بہت تعریف کرتے تھے۔

خوف عزت

ایک مرتبہ کا ذکر ہی کہ رشید لکھنؤ میں کہیں مرثیہ پڑھنے جا رہے تھے
شکرم کی سواری تھی۔ اتفاق سے شکرم کسی دوسری گاڑی سے لڑ گئی اور گھوڑے بھڑک

بیچارہ اس قدر خائف ہوئے۔ کہ دعائے خوف پڑھنے لگے۔ خدا خدا کر کے جانور
دھیمے ہوئے اور رشید کو مقام مقررہ پر پہنچا دیا۔ اُس روز سے آخری دم تک
پھر کبھی شکرم پر نہیں بیٹھے۔ پالکی میں جایا کرتے تھے +

بجلی اور رشید بجلی سے بہت ڈرتے تھے۔ جب آسمان پر تصادم ابر و باد ہوتا تھا۔ وہ
باہر نظر نہ آتے تھے۔ ذرا بھی اگر کوندے کی لپک کے آثار نمایاں ہوئے۔ رشید
گھر کے آخری کونے میں جا چھپتے تھے۔ اور رضائی اوڑھ لیتے تھے۔ اگر کہیں مینھ اور گرج گرما
شروع ہو جاتی تھی۔ تو بس پھر غضب کا سامنا تھا۔ کانوں کو ہاتھوں سے بند کر لیتے تھے
اور جب تک فضائی فرشتوں کی شورش برطرف نہ ہوتی تھی۔ اُس وقت تک وہ گوشہ
ہوتا تھا۔ اور رشید +

تکالیف کا اندازہ انسان کو اُس وقت تک نہیں ہوتا۔ جب تک خود مبتلا نہ ہو۔
یا کسی دوسرے کو اُن کے شکنجہ میں۔ عبرت کی نگاہ سے نہ دیکھ لے۔ سُنا جاتا ہی کہ
ایک مرتبہ رشید نے کسی برق زدہ شخص کو دیکھ لیا تھا۔ چونکہ بحیثیت شاعر سریع الحس
قلب پایا تھا۔ اس لیے جب بجلی چمکتی تھی۔ اُن کو اس سلسلہ میں وہی واقعہ یاد آ جاتا تھا +

استغنا ایک صاحب فیض آباد میں بالکل غریب آدمی تھے وہ جناب رشید کو
اپنے یہاں مجالس پڑھوانے کے لیے لے گئے۔ تین مجلسیں انھوں نے پڑھیں۔ وہ
بیچارہ مصارف سفر کہیں سے فراہم کر کے رشید کو دینے لگے۔ رشید نے
قطعًا انکار کیا۔ دو سال تک اپنے ہی مصارف سے گئے۔ تیسری سال جب انھوں نے
بہت ہی مجبور کیا۔ اور ٹکٹ ہی لا کر دے دیا۔ تو رشید نے مجبورًا منظور کیا +

ضلع مظفر نگر میں کھتولی ایک مقام ہی وہاں کے ایک باشندہ سید حافظ علی صاحب

لکھنؤ آئے۔ اور جناب رشید کو اپنے ساتھ لے گئے۔ سید صاحب بارہے کے ایک پُر جوش شیعہ تھے۔ مگر دولت نہ رکھتے تھے۔ رشید کو پڑھوانے کا شوق تھا چہلم کا زمانہ تھا۔ رشید نے چار مجلسیں پڑھیں۔ تمام گرد و نواح کے سادات بارہ جمع ہوتے تھے۔ اور اس مداحِ خاندانِ رسالت کو سچی داد دیتے تھے۔

جب مجالس ختم ہوئیں۔ صاحب مجلس نے ایک سوتیس ۱۳۰ روپیہ صرف مصارف آمد و رفت کی حیثیت سے پیش کیے۔ رشید نہیں لیتے تھے۔ مگر اُنھوں نے باصرار دے ہی دیے۔ رشید کو یہ اصرار ناگوار ہوا۔ اور کئی سال تک نہیں گئے۔ مگر سید صاحب آخر کار اس قدر مصر ہوئے۔ کہ ایک مرتبہ کہنے لگے۔ اگر آپ اب تشریف لے چلیے گا تو امام حسینؑ سے فریاد کروں گا۔ رشید پھر جانے لگے۔ اور صرف مصارف سفر لے لیتے تھے۔ اور بس +

رشید اور غزل

انیس کے زمانہ سے کچھ قبل تک ،، بگڑا ہوا شاعر مرثیہ گو ،، کہلاتا تھا۔ مگر انیس نے اس کی تردید کر دی۔ اور ثابت کر دکھایا۔ کہ لوگوں کا خیال غلط ہے۔ اُنھوں نے مرثیہ گوئی کو اس قدر وسعت دی کہ اس صنف کے مجدد کہلائے۔ چنانچہ ایک سلام میں بجا فخر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ؎

مری قدر کر اے زمینِ سخن تجھے بات میں آسماں کر دیا

غزل کے یہی معنی نہیں کہ وصال۔ ہجر۔ اُمید۔ یاس۔ حسرت وغیرہا کے مضامین ایک معینہ قافیہ و ردیف میں کہے جائیں۔ بلکہ یہی مضامین کسی دوسری صنفِ سخن میں کھپ سکتے ہیں۔ بشرطیکہ اُن کے نظم کرنے والے میں پوری قدرت ہو کہ انھیں دوسرے لباس میں آراستہ کر سکے۔ میں اپنے قول کی تائید میں مولانا شہری مرحوم کی

[illegible]

[illegible]

[illegible] شغل [illegible] مرثیہ گوئی [illegible]

[illegible] کہا اگر یہ شغل یعنی بوصف حسن کے شستہ [illegible] ہے اگرچہ [illegible] کہا [illegible]

[illegible] بھی کہیں۔ اور بعض کہیں جن کا مجموعہ ان کے تلامذہ میں [illegible]

[illegible] کے ہیں۔

ہو نا امید جو ساقی ہو کیوں نہ [illegible]	اگر تو ہی نہیں [illegible]
[illegible] جام ہمارا شکستہ [illegible]	ان کا [illegible] خاک میں ہم [illegible]
[illegible] سخن [illegible]	[illegible] نہیں پسند [illegible] پسند [illegible]

لیکن جب سے مرثیہ گوئی میں زیادہ انہماک ہوا اس وقت سے مشق غزل بالکل ترک

کر دی تھی۔ جناب میر رشید فرماتے تھے کہ لکھنؤ میں کوئی مرثیہ شاعرہ منعقد تھا جس

میں [illegible] تھا۔ اور مشق سخن کی ابتدا تھی۔ میں نے غزل کہی اور [illegible]

[illegible] کرنے لگا مصرع طرح یہ تھا۔

دل کی بے تابی سے اور اپنی [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

بارہ دری میں مخلوق قبل بھی مجمع ہوگیا۔ بعد انتظار انیس تشریف لائے۔ اور رونق افروز ممبر ہوئے۔ زیرِ ممبر نفیس و مونس کے ہمراہ رشید بھی بیٹھے تھے۔ انیس نے دو رباعیاں پڑھنے کے بعد فرمایا "پیارے ہماری غزل سنو"۔ اور یہ کہہ کے سلام شروع کیا۔ جس کا یہ ایک شعر ہے۔

کہتے تھے سرورِ علی اکبر کا مرنا ہائے ہائے
کیا غضب ہوگا جو صغرا کو خبر ہو جائے گی

یہ پورا سلام اس قدر مہیکی تھا۔ کہ چاروں طرف سے گریہ کی صدائیں بلند ہوگئیں۔

معلوم ہوا کہ انیس کا ملکۂ خداداد مرثیہ گوئی میں کسی صنفِ سخن کا محتاج نہ تھا۔ مرثیہ اُن کے لیے بنا تھا اور وہ مرثیہ کے لیے۔

غزل کی اہمیت

حقیقت یہ ہے کہ یہی غزل کے دو مصرعے ایک ذہین شاعر کی بناء کے لیے دو سنگین ستونوں کا کام دیتے ہیں۔ اگر ان کو پہلی پہل مضبوط پکڑ کے شاعری کے دوسرے دشوار گذار راستوں میں قدم بڑھایا جائے۔ تو منزلِ مقصود تک پہنچنا سہل ہے۔ وجہ یہ ہے کہ غزل جس کا نام ہے۔ اُس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ مشکل بھی۔ اس کا ہر شعر خیال کی ایک اور ایک ہی تصویر پیش کرنے کی قابلیت رکھتا ہے۔ جس کی تکمیل ایک سنجیدہ فنکار ہی خوب جان سکتا ہے۔ یا وہ شخص جس کی نگاہوں کے سامنے مناسبت و پختگی کا فطرتی تماشا ہر وقت موجود ہو۔

جب ایک شعر اس طرح مکمل ہو جاتا ہے تو اب شاعر کا خیال دوسرے مضمون کو اٹھاتا ہے۔ اور اسمیں مستغرق ہو جاتا ہے۔ اسلیئے کہ اس دوران میں کسی دوسرے مضمون کو دماغ میں چھیڑ دینا پہلے خیال کی تکمیل میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔

غزل کے علاوہ دوسرے اصناف سخن کے لیے کم و بیش تسلسل کی سخت ضرورت ہی مثلاً قصیدہ۔ مثنوی۔ مرثیہ وغیرہا میں۔ رہا غزل کا مذاق سلیم کی حدوں میں رہنا۔ یہ کسی نہیں بلکہ وہبی ہی۔ بہرحال ایک شعر جس کو شعر کہہ سکتے ہیں اپنی خاص طرز میں پختہ اور بے مثل ہے۔ نکتہ رس فکر نقاد دونوں کا فرق خوب سمجھ سکتی ہی۔ لہذا مثال دینا۔ یا موازنہ کرنا تحصیل حاصل ہی۔

رشید کا سلسلہ تلمذ

رشید اول تو ایسے طبقہ میں پیدا ہوئے تھے۔ کہ شاعری جن کی میراث تھی۔ لطف یہ کہ ننہال کے افراد مرثیہ گوئی میں طاق۔ ددھیال کے غزل گوئی میں شہرۂ آفاق۔ ان کا وجود ایک ایسا نونہال تھا۔ جس کو چمنستانِ سخن کی دو ہواؤں نے پرورش کیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ انھوں نے سخن کی دونوں صنفوں سے بہرۂ کامل حاصل کیا۔ اور دونوں خاندانوں کے کمال کو زندہ رکھا۔

رشید اپنے نانا کی حیات میں سنِ تمیز کو پہنچ چکے تھے۔ اور اُن کے کمال کے مظاہروں سے سبق حاصل کرتے رہتے تھے۔ اکثر غزلیں میر انیس کو دکھائیں۔ مگر زیادہ تر عشق مرحوم کو۔ چنانچہ اُس مرثیہ میں جس کا مطلع یہ ہی۔

میں ہوں سلطان سخن مجھ سے بڑھی شان سخن،

علاوہ دوسرے تعلقات کے شاگردی عشق کی طرف بھی اشارہ ہی۔

میں بھی ہوں وارثِ طرزِ سخن میر انیس
مونسِ خلق ہوں ہیں میری زباں پر جو سلیس

ہوں تعشق کے سبب ملکِ مضامیں کا رئیس
ایک ہی باغ کے دو پھول ہیں یہ اور نفیس

خوب تحقیق ہیں بچپن سے رہی کد مجھ کو
مستند ہوں کہ ملی عشق کی مسند مجھ کو

رشید کی غزل پر زیادہ تر سید صاحب تعشق مغفور کے طرزِ خیال کا

پورا پورا پرتو نظر آتا ہی۔ حالانکہ ابتداءً اُن سے رشید کو شرفِ تلمذ حاصل نہ تھا ہاں جناب سید باقر صاحب حمید مرحوم اُن کے ساختہ و پرداختہ تھے۔ معلوم ہوا کہ رشید کی طبیعت میں فطرت نے مذاقِ سلیم کا جوہر پہلے ہی سے ودیعت کر دیا تھا۔ جس پر صرف معمولی صیقل درکار تھی۔ جو تعشق مرحوم کی صحبت سے حاصل ہوئی۔ مگر عشق مرحوم کے بعد رشید تعشق ہی سے اصلاح لیتے تھے۔

رشید کا شعر

رشید کے تمام کلام پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہی کہ وقتِ نظم اُن کی پہلی کوشش صفائے بندش۔ روانی۔ اور لطافتِ محاورہ میں صرف ہوتی تھی۔ اس کے بعد درستیِ خیال۔ چُستیِ مضامین کی طرف توجہ مبذول کرتے تھے۔ چنانچہ اُن کے کلام میں بعض اوقات ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ جس میں صفائیِ زبان کی بے جد وجہد نے مضامین کو بالکل سادہ کر دیا ہی۔ نظم میں شیریں زبان۔ یا نرم زبان ہونے کے یہ معنی کبھی نہیں۔ کہ خوبیِ مضامین ہاتھ سے جاتی رہی۔ بلکہ ایک زبان کہنے والے شاعر کو دونوں پہلوؤں پر برابر کی نظر ڈالنی چاہیے۔ جس کی کوئی دوسری مثال سوائے انیس کے نہیں ملتی۔ نرم گرم پہلو سب کے یہاں پائے جاتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا۔ کہ رشید اس کُلیہ سے مبرا ہیں۔ مگر اتنا ضرور کہوں گا۔ کہ اگرچہ بعض مقامات پر اُن کے ہاں شعر بالکل سادہ نظر آتا ہی۔ مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ خوبی ضرور پائی جاتی ہی۔ لیکن جہاں زبان و مضامین دونوں کو کامیابی ہو جاتی ہی۔ اُس کا کیا کہنا۔ چنانچہ ایک مطلع فرماتے ہیں۔

خاکِ حسرت لے گئے دل لٹ کے وہاں سے گئے آپ کے دیوانے ساتھ اپنے بیاباں لے گئے

دوسرے مصرعہ میں جس حسن سے محاورہ صرف ہوا ہی۔ اُس کا جواب نہیں۔

معاملہ بندی | رشید غزل اپنی زبان میں کہتے تھے جس میں معاملہ بندی کا عنصر قوی۔ عاشقانہ مضامین جیسے غزل میں شوخی اُسی قدر ہوتی ہے۔ جہاں تک وہ مذاقِ سلیم کی حدود میں سہے۔ اور مبتذل نہ ہو جائے۔ اور یہی مشکل ہے۔ مرحوم نے سلاست واثر کو اپنے کلام میں اس قدر جگہ دی ہے۔ کہ ایک معاملہ گو شاعر سے اتنی اُمید نہیں ہو سکتی۔

خلاصہ یہ کہ رشید جو کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ صفائے بندش۔ سلاست بیان اس پر کچھ اور اضافہ کر کے پیش کرتے ہیں۔ کوئی مضمون غیر مانوس ترکیبوں سے دبنے نہیں پاتا۔ اور حقیقت میں شاعری اسی کا نام ہے۔ مضامینِ عالیہ کو الفاظ کے قالب میں بند کرنا۔ ہر شاعر کا کام نہیں۔ بہت بھٹک چکے اور بھٹکیں گے۔ خیر۔ جو رنگ جس کو پسند ہو وہی بہتر۔ جس زمانہ میں ہندوستان جدید تمدن کی ایک منزل اور طے کر چکے اور فن تنقید کو رواج ہوگا۔ اُس وقت عوام اس کا تصفیہ کر سکیں گے۔

شعر کے متعلق رشید کی رائے | میں رشید کے مذاقِ صحیح کا ذکر کر رہا ہوں۔ اور اسی سلسلہ میں ایک نقل پیش کرتا ہوں۔ جناب محشر لکھتے ہیں۔

نقل

ایک دن زیارت کو میں حاضر خدمت ہوا۔ باتیں کرتے کرتے مجھ سے فرمایا "کیوں محشر! شاعر کو کیا کرنا چاہیے؟" میں نے عرض کی "تا امکان جذباتِ اصلی نظم کرنے کی قوت ہونی چاہیے۔" فرمایا "اس کے ساتھ اتنا اور بڑھا دو۔ کہ سیدھی زبان میں۔"

نوٹ

واقعی عربی اور فارسی کی سنگین ترکیبوں۔ اور لفظوں کا بوجھ غزل نہیں اٹھا سکتی۔

رشید اپنے شاگردوں سے اکثر فرمایا کرتے تھے۔ کہ تخئیل کا مزا اسی وقت ہے۔ جب مناسب الفاظ میں نظم بھی ہو جائے۔ اگر کسی شاگرد کی غزل میں کسی جگہ کوئی ثقیل لفظ ہوتی تھی۔ تو اس کو ایسے عمدہ لفظ سے بدل دیتے تھے۔ کہ مطلب ہاتھ سے نہیں جانے پاتا تھا۔ بلکہ اور شعر میں ترقی ہو جاتی تھی۔ چنانچہ ایک روز ایک شاگرد نے غزل پیش کی جس کا مطلع یہ تھا۔ ؎

دل مجروح پہ احسان تمہارا ہوتا
اور اک تیر اگر زخم پہ مارا ہوتا

دوسرے مصرعہ میں بجائے "زخم پہ" کے "پاس سے" بنا دیا۔ اب شعر کو پڑھیے تو سلاست و ترقی لفظ کا اندازہ ہو۔ حاصل کلام یہ کہ وہ خود بھی دلدادۂ زبان تھے۔ اور دوسروں سے بھی یہی اُمید رکھتے تھے۔ چنانچہ میں اپنے قول کی تائید میں۔ جناب عزیز لکھنوی کا ایک خط درج کرتا ہوں۔ وھو ھذا

"زمانہ کا رنگ ہر چیز میں جاری و ساری ہے۔ اور اسی سے زبان بھی مستثنیٰ نہیں رشید کے عہد میں زبان اُردو میں ایک عظیم انقلاب پیدا ہوا۔ کچھ تو بضرورت۔ اور کچھ اخبارات و رسائل اور جدید تعلیم یافتہ حضرات کی دریا دلی اور فیاضی سے خصوصاً پنجاب سے یہ گھٹائیں اُٹھیں۔ اور نا واقفان زبان پر چھا گئیں۔ مگر رشید اپنے اصلی مرکز پر قائم رہے اور اُردو کی اصلی عظمت کو نظر انداز نہیں کیا۔

رشید کی غزل میں عُمق نہیں ہوتا تھا۔ صاف صاف شعر ہوتے تھے۔ مگر رنگ و اثر کا ملمع تقریباً ہر شعر پر ہوتا تھا۔ تخئیل میں جدت کم ہوتی تھی مگر سلاست و تاثیر کے دریا بہتے تھے۔ اور اس میں شک نہیں کہ کلام

زبان کا بہترین نمونہ ہو۔ تو ایسی اضافات و تراکیب فارسی سے اُن کو اُنس نہ تھا۔ میں نے محلے کی صحبت میں اُن کو ایک غزل اپنی سنائی۔

شرحِ جنونِ سلسلۂ جنباں کیے ہوئے
بیٹھا ہوں چاک چاکِ گریباں کیے ہوئے

مطلع سُن کر کہنے لگے "بھائی پہلا مصرعہ بالکل فارسی ہو گیا" اور اشعار کی داد دی جس کا ذکر میرے لیے مناسب نہیں۔ نادان محل میں میر نواب علی صاحب کے مکان پر ایک قصیدہ خوانی کی صحبت تھی اُس میں حضرت رشید و عمید بھی تھے۔ میں نے قصیدہ پڑھا۔

شب ہوئی انجمِ تابندہ کا لشکر نکلا
پرچمِ فتح لیے ماہِ منور نکلا

اس قصیدہ میں جو اشعار زبان کا پہلو لیے ہوئے تھے اُس کی داد حضرتِ رشید نے خاص طور پر دی۔

اس سے مقصود اپنی تعریف نہیں بلکہ یہ دکھانا ہے کہ نظم میں ان کا تمام تر خیال صرف زبان پر رہتا ہے اُسکا التزام وہ خود بھی کرتے تھے اور دوسروں کو بھی ہدایت کرتے تھے"

جناب محشر حسب ذیل رقمطراز ہیں۔

ایک روز جناب رشید کی خدمت میں سہ پہر کو حاضر ہوا گرمیوں کا زمانہ تھا سید کے حوض میں تیار رہے تھے مجھے دیکھکر بے اختیار فرمایا بھئی محشر ابھی یہ شعر کہا ہے [illegible] ان اللہ [illegible] پڑھا۔

طاقت آئی مگر اعضا میں یکساں آ گئی
روح بھی جسم میں آئی تو پریشاں آ گئی

میں نے تعریف کرکے عرض کی کچھ اور۔ ہنس کے بولے تغیر و نظم کروں۔ غرض کہ دو دست کے بعد یہ شعر پڑھا۔ ؎

کبھی بجلی بھی گرے یا تو عجب ہے کچھ بیاں
آج کیا تھا جو سوئے گور غریباں آ گئی

مکرمی جناب مرزا امداد علی بیگ صاحب۔ برادر جناب نواب نصیر الممالک میرزا شجاعت علی خاں بہادر۔ یہ واقعہ بیان فرماتے ہیں۔ کہ ایک مرتبہ ماہ ربیع الاول میں جب رشید مجالس پڑھنے کلکتہ تشریف لائے۔ نواب نصیر الممالک کے یہاں مجالس شروع ہوئیں۔ ایک مجلس کسی ایرانی ذاکر نے پڑھی۔ چونکہ زبان فارسی تھی اس وجہ سے پورا مضمون مجلس عوام نہ سمجھے۔ صرف جہاں نام حسینؑ آیا رو دیے۔ بعد ختم مجلس لوگوں نے جناب رشید سے خواہش کی۔ کہ اس روایت اور مضمون کو جو اس مجلس میں ذکر ہوئے تھے۔ مرثیہ کی صورت میں نظم کرکے سنا دیں۔ جناب رشید خاموش رہے۔ اور کچھ جواب نہ دیا۔ دوسرے روز جو ممبر پر تشریف لے گئے۔ تو بعینہ مرثیہ کا وہی مضمون تھا۔ جو مجلس گذشتہ میں لوگوں نے فارسی میں سنا تھا سامعین کو حیرت ہوئی۔ کہ رشید نے اس قدر جلد اور اس خوبی سے کیونکر وہ مضمون نظم کر لیا۔ جتنے کہ آج تک حضرات کلکتہ رشید کو جب یاد کرتے ہیں۔ تو اس واقعہ کو ان کے کمال کی سند میں پیش کرتے ہیں۔ بقول میر نواب صاحب مونس " ایک وقت میں سو سوا سو بند مرثیہ کے کہہ لینا شاعروں کے نزدیک کوئی بڑی بات نہیں۔

ذیل کا واقعہ مرحوم کے انتظام شاعری کے متعلق نقل کیا جاتا ہے

نقل ایک روز جناب رشید مرحوم بیٹھے ہوئے کچھ تصنیف کر رہے تھے۔

میں پہونچ گیا۔ مجھ کو دیکھ کر بادامی کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے چھپانے شروع کیے میں نے جسارت کرکے کہا: کہ آپ کیا خراب کاغذ پر تصنیف فرماتے ہیں؟ جواب ملا۔ وہ بھائی یہ معشوقوں کے خط و خال۔ ناز و ادا۔ غمزہ و عشوہ کا ذکر نہیں۔ جس کے لیے عمدہ اور نفیس کاغذ کی ضرورت ہو۔ بلکہ مصیبت زدوں کا مرثیہ ہی۔ اُس کے لیے مصیبت زدہ لباس۔ یعنی خستہ کاغذ ہونا چاہیے +

لطیفہ

جناب حکیم سید فضل علی صاحب عرف میرن صاحب جو رشید کے یک جہت احباب میں ہیں۔ اُن کے بڑے صاحبزادہ صاحب عالم کی شادی۔ حکیم صاحب موصوف کے بھائی کی دختر سے ہوئی۔ جلسۂ نکاح میں رشید بھی مدعو تھے۔ جب عقد ہو چکا تو جناب رشید نے حکیم صاحب کی طرف مخاطب ہو کے فرمایا ؎

یہ آپس کی شادی بہت مجھ کو بھائی   کہ سمدھی کے سمدھی ہیں بھائی کے بھائی

اہل محفل اس برجستہ مزاج شاعرانہ سے بہت خوش ہوئے +

لکھنؤ کے مشاعرے اور رشید

آخر شباب تک رشید مشاعروں میں بیشتر شریک ہوتے تھے۔ مگر جب سے مرثیہ گوئی کی طرف زیادہ توجہ ہوئی۔ مشاعروں کی شرکت کم کر دی تھی۔

قریب قریب تمام مرثیہ گویوں کا یہی اصول ہی۔ کہ جب مرثیہ کی طرف زیادہ توجہ ہو جاتی ہی۔ تو غزل گوئی سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔

رشید نے گویا غزل گوئی ترک نہیں کی تھی۔ کیونکہ وہ فکر غزل کو مرثیہ میں اس خوبی سے صرف کرتے تھے کہ غزل کا لطف بھی آ جاتا تھا۔

جب مشاعرہ میں۔ کامل۔ ماہر مشتاق۔ جاوید۔ عارف۔ آوج اپنے کاملین فن

موجود ہوتے تھے وہاں رشید بھی ضرور ہوتے تھے۔ یہ حضرات اپنی بہترین فکروں کے نمونے پیش کرتے تھے۔ اور خاطر خواہ داد سخن لیتے تھے۔ مگر زمانہ شاہد ہے کہ جب رشید مغفور کے سامنے کنول آتا تھا۔ تو بزم مشاعرہ میں ایک سناٹا سا چھا جاتا تھا۔ اور ان کی شاعری کا چراغ جلنے لگتا تھا۔ اور جب غزل پڑھتے تھے۔ اُس وقت کا سماں قابل دید ہوتا تھا۔ اُن کے بعد اول تو کوئی پڑھتا نہ تھا۔ اور اگر پڑھا بھی تو گویا رسم مشاعرہ کا ادا کرنا سمجھیے۔ اس مرجعیت کا سبب وہی اُن کی سادگی کلام اور جذبات نگاری تھی۔

فاخر مرحوم نے لکھنؤ میں ایسے ایسے مشاعرے کیے کہ زبان زد عوام ہیں۔ جناب عشق مغفور اور جناب غضنفر علی خاں عرف بڑے بھیا صاحب حکیم کے مشاعروں کا ذکر بھی اکثر ہوتا ہے۔ آخری وقت میں خدنگِ نظر کے مشاعرے بھی غنیمت ہوئے۔ ان مشاعروں کے بعد رشید نے گویا شرکتِ صحبتِ سخن بالکل ترک کر دی تھی۔ منشی نوبت رائے صاحب نظرؔ نے ادب اُردو کی بیش قدر خدمت کی ہے۔

ایک مرتبہ ۱۹۱۰ء میں جناب مرزا محمد ہادی صاحب عزیزؔ نے مشاعرہ کیا۔ طرح تھی

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا

یہ عظیم الشان مشاعرہ میر تقی میر علیہ الرحمہ کی "صد سالہ یادگار" میں قائم ہوا تھا پرفیسر مرزا رسوا نے اس بزم میں ادب اُردو کے متعلق ایک نہایت پُر زور تقریر کی تھی۔ لکھنؤ کے تمام سخن سنج۔ اور خوش گو حضرات جمع تھے۔ جناب رشید سے بھی وعدہ لیا گیا۔ اور مرحوم نے بپاسِ خاطر عزیزؔ منظور کیا۔ لیکن مشاعرہ میں تشریف نہیں لائے۔ بلکہ دوسرے روز جناب عزیزؔ سے خود ملنے آئے۔ اور عذرِ عدم شرکت یہ کیا۔ کہ اگر میں یہاں شریک ہوتا۔ تو دوسروں کو شکایت کا موقعہ مل جاتا۔ یہ کہہ کے چند اشعار

طرح میں سُنائے۔ اور واپس تشریف لے گئے ؛

انجمن دائرہ

اراکین معیار کی طرف سے ایک انجمن موسوم بہ "انجمن دائرہ" قائم ہوئی تھی جناب رشید اُس کے پہلے جلسہ میں تشریف لے گئے تھے۔ مگر اُس کے بعد پھر کبھی شریک نہ ہوئے رسالہ معیار کے ابتدائی دَور میں رشید کی متعدد غزلیں پائی جاتی ہیں۔ مگر یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔

جناب عزیز تحریر فرماتے ہیں۔ کہ جس زمانہ میں معیار کے مشاعروں کی لکھنؤ میں دھوم تھی۔ اکثر تلامذہ طرح میں اُن سے غزلیں بنوا لے جایا کرتے تھے۔ خود مشاعروں میں شرکت ترک کر دی تھی۔ مگر کبھی کبھی طرح میں غزل یا سلام کہہ لیا کرتے تھے۔ اور ہم لوگوں میں سے جب کوئی ملتا تھا۔ تو کہتے تھے " بھائی تمہارے یہاں کی طرح میں۔ میں نے بھی کچھ کہا ہے " سلام ہوا تو ممبر پر سُنایا۔ غزل ہوئی تو آنے والے نے مکان پر سُنی +

مسئلہ تحفظ زبان

جہاں جہاں علوم کے مرکز ہیں۔ وہاں کے حضرات علم ادب کی ترقی کے متعلق گاہے گاہے اپنی سرگرمیاں مختلف صورتوں میں ظاہر کرتے ہیں۔ جن سے جلسوں میں وقتی چہل پہل ہو جاتی ہے۔ اس سے بحث نہیں۔ کہ وہ نتیجہ خیز ثابت ہوں یا نہیں۔ زمانہ جس روش پر چاہتا ہے چلاتا ہے کسی کی تدبیر اُس کے خلاف کارگر نہیں ہوتی اسی طرح لکھنؤ میں بھی ایک مرتبہ "تحفظِ زبان" کا مسئلہ درپیش ہوا۔ اُس وقت کے نامور ادیب۔ اور شاعر۔ غیر معمولی جوش کا اظہار کرنے لگے۔ ہر شخص بجائے خود اپنے کو تحفظِ زبان کا ذمہ دار سمجھنے لگا۔ پھر کیا تھا۔ جناب حامد علی خاں صاحب حامد بیرسٹر مرحوم کی تحریک سے نواب باقر علی خاں صاحب رئیس لکھنؤ (خلف نواب مہدی علی خاں صاحب مرحوم) نے اپنے وسیع مکان میں ایک بہت بڑا جلسہ منعقد کیا۔ تاکہ مسئلہ مذکور کے متعلق عملی تدابیر

غور کیا جائے۔

یہ جلسہ بالکل مغربی تہذیب کے موافق تھا۔ شعرائے لکھنؤ میں حضرات جاوید جمید حامد۔ عزیز۔ اثر۔ وغیرہم شریک تھے +

رشید صدر جلسہ مقرر ہوئے

جلسہ شروع ہوا۔ اور چند موقر حضرات کی تحریک و تائید سے حضرت رشید رئیسِ مجلس منتخب ہوئے۔ رشید کرسیِ صدارت پر بیٹھے۔ غالباً اُن گوشہ گیر و عافیت پسند مرحوم کے لیے یہ پہلا موقع تھا۔ جناب حامد مغفور اور دیگر حضرات نے تحفظِ زبان، کے متعلق تقریریں کیں۔ اور بالاتفاق یہ طے پایا۔ کہ ایک "لغت خاص" لکھنؤ کے اربابِ فن اور اہلِ زبان مرتب کریں۔ بانیِ جلسہ نے اپنی عالی ہمتی سے اس کام کے لیے۔ ایک رقم کثیر دینے کا وعدہ بھی فرمایا تھا۔ مگر انجام کیا ہوا؟ یہ نہ پوچھیے۔

حضرتِ رشید نے اُس جلسہ میں کچھ باتیں درمیان میں۔ اور کچھ ختم صحبت پر فرمائی تھیں۔ جو نہایت دلچسپ اور کارآمد تھیں۔ ایک محل پر اصنافِ سخن کے متعلق فرمایا تھا "غزل۔ قصیدہ۔ مثنوی۔ ان سب کی زبانیں الگ الگ ہیں" جس کی شرح اہلِ زبان۔ اور ماہرینِ فن بہت کچھ کر سکتے ہیں +

انصاف پسندی

خاندانِ انیس کے مشہور مرثیہ گو جناب میر علی محمد صاحب عارف مرحوم کی مجلس سوم میں جناب رشید تشریف لائے۔ چہرہ اُترا ہوا۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے ہوئے۔ پس ماندگانِ عارف سرشک آلود آنکھوں سے اس بزرگ خاندان کے اظہارِ تعزیت کو قبول کر رہے تھے۔ کہ یکایک رشید نے پُر درد لہجہ میں فرمایا۔

"افسوس خاندانِ انیس کا شیر اُٹھ گیا۔ یاد رکھو عارف کا مثل نہ تھا۔ اب لکھنؤ کو قدر ہوگی۔ کہ مرثیہ گوئی کیا چیز ہے۔ اور فن کس کا نام ہے"۔

مجھے اس وقت جناب حامد علی خاں صاحب بیرسٹر مرحوم کا شعر یاد آگیا۔ جو انھوں نے گویا ایسے ہی مواقع کے لیے تصنیف کیا تھا۔ فرماتے ہیں ؎

یہ منزلت بھی غنیمت ہی اہلِ دُنیا کی　　　ملا کے خاک میں ذکرِ کمال ہوتا ہی

ایک دوسرے موقع پر فقیر مؤلف اور چند دوسرے حضرات خدمتِ رشید میں حاضر تھے کہ ایک شاگرد نے ایک نظم اصلاح کے لیے پیش کی۔ جو کسی جلسہ میں پڑھنے کے لیے کہی تھی۔ رشید نے اول سے آخر تک نظم کو دیکھا۔ اور مجھ سے مخاطب ہو کے فرمایا "اشہر قومی نظم کا کہنے والا اس وقت صفی سے بہتر لکھنؤ میں نہیں"

تفاخرِ شاعرانہ دوسری چیز ہی۔ رشید میں خود نمائی اور خود ستائی بالکل نہ تھی۔ اُن کی نظروں میں ہر صاحبِ کمال کے کمال کا صحیح اندازہ تھا۔ اور اسی کی مناسبت سے عظمت بھی۔ اہلِ فہم کے نزدیک انصاف پسندی بجائے خود ایک کمال ہی۔

بہترین مثال انداے سخن میر تقی کا انصاف

میر تقی میر نے اپنے معاصرین کا ایک مختصر تذکرہ فارسی میں لکھا ہی جو ابھی انجمن ترقی حیدرآباد کی طرف سے چھپا ہی۔ اُس میں قابلِ لحاظ یہ امر ہی۔ کہ میر صاحب نے ہر شاعر کے کلام پر انصافانہ نظر ڈالی ہی۔ اور میرے خیال میں داد تذکرہ نویسی دی ہی۔ لیکن قابلِ صد تعریف یہ امر ہی۔ کہ وہی سودا جو اُن کا مردِ میدان اور فنِ شاعری کا حریف تھا۔ اُس کی نسبت میر کے قلم نے ذرا لغزش نہیں کی۔ اور جس انصاف کا وہ مستحق تھا۔ اُس سے کچھ زیادہ اُس کی مدح سرائی کی ہی۔ ذیل کی چند سطریں ملاحظہ ہوں۔

مرزا رفیع المتخلص بہ سودا۔ کہ جوانے خوش خلق و خوش خوئے۔ گرم جوش یار باش۔ بشگفتہ روئے۔ مولدِ او شاہجہان آباد است۔ نوکری پیشہ۔ غزل و قصیدہ

و مثنوی و قطعہ و مخمس و رباعی۔ ہمہ را خوب مے گوید۔ سرآمد شعرائے ہندی اوست
بسیار خوش گو ہست۔ ہر شعرش طرفے لطف رستہ رستہ۔ در چمن بندیِ
الفاظش گل معنی دستہ دستہ۔ ہر مصرعۂ برجستہ اش راسرو آزاد و بندہ
پیش فکر عالیش شرمندہ۔ شاعر ریختہ۔ چنانچہ ملک الشعرائی ریختہ
او را شاید۔ قصیدہ در ہجو ہست گفتہ بہ تضحیک روزگار۔ دور از حد مقدور دراو
صفتہا بکار بردہ۔ از اتفاق طرح غزل با ہم می افتد۔ از مغتنمات روزگار است
حق تعالےٰ سلامتش دارد" (از تذکرہ میر صفحہ ۳۲)

رشید و شعرائے لکھنؤ

تمام شعرائے لکھنؤ رشید کو سند مانتے تھے۔ اور اُن کے تصنیفہ کو نظر قبول سے دیکھتے تھے۔ اگر کوئی رسالہ شعر و سخن کا جاری ہوتا تھا۔ تو رشید کے کلام کو باعث رفعت سمجھ کر ایک ممتاز جگہ چھاپتے تھے۔

لفظ "آبدست" مؤنث ہے

چنانچہ جب لفظ "آبدست" کے متعلق تذکیر و تانیث کا جھگڑا ہوا تو حکیم جلال مرحوم۔ اور دیگر نامی شعراء نے لکھا۔ کہ آبدست مذکر ہے۔ اس وجہ سے کہ "آب" اور "دست" دونو مذکر ہیں لہذا دونوں کی ترکیبی صورت بھی مذکر ہونی چاہیے۔

جس وقت جناب رشید سے اس لفظ کے متعلق استفسار کیا گیا تو انھوں نے فرمایا "میں۔ اور میرا خاندان اس لفظ کو مؤنث بولتا ہے"۔ اور مزید شہادت یہ دی کہ انیس مغفور بھی اس لفظ کو مؤنث بولتے تھے۔ رشید اس دور آخر میں ایسے خوش نصیب شاعر تھے جن کو اُن کے معاصرین نے بھی مانا۔ یہ بات اس عہد حریت میں نعمت سے کم نہیں۔

رسالہ معیار کی ابتدا

نواب حامد علی خاں صاحب بیرسٹر مغفور نے جو ادب اُردو کی خدمت کی ہے اُس کی داد کون دے سکتا ہے۔ ع "خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں"

مرحوم نے "معیار" ایک ادبی رسالہ کی بنا ڈالی۔ جس کی عجب انوکھی طرز تھی حصۂ نثر کے معاونین جو قابلِ ذکر ہیں۔ یہ تھے۔ مولانا سید علی حیدر صاحب نظم طباطبائی۔ مولوی سید اولاد حسین صاحب شاداں بلگرامی۔ مولوی سید احمد صاحب ناطق لکھنوی منشی احمد علی صاحب شوق قدوائی۔ پروفیسر مرزا محمد ہادی صاحب رسوا۔

معاونین حصۂ نظم کے لکھنؤ کے خوش گو شعرا

مثلاً جناب صفی۔ جناب ثاقب۔ جناب عزیز۔ جناب محشر۔ جناب احسن۔ جناب آرزو جناب طمع۔ جناب ثروت۔ جناب بہار۔ جناب شرر۔ جناب فاضل۔ وصف شفیق وغیرہم اُس کے خاص ممبر تھے۔ ہر ممبر کے مکان پر باری باری ماہوار مشاعرہ ہوتا تھا۔ پہلے منتخب قوافی طبع آزمائی کے لیے دیدیے جاتے تھے۔ اور پھر ہر قافیہ کے تحت میں ہر ایک کا شعر تقابل کی صورت میں معیار میں چھاپا جاتا تھا۔ چند شعر یہاں نمونۃً تحریر ہیں

مشاعرۂ جناب محشر منعقدہ ۲۷ نومبر ۱۹۰۹ء

احسن۔ بس وصل اُن سے چھٹ جانا کہ بعد وصل مر جانا + بہر صورت دو روزہ زندگی کے دن گذر جانا

آرزو۔ اُدھر سے گہ ادھر جانا ادھر سے گہ اُدھر جانا + یونہی اکثر ترے کوچہ میں ہم کو دن گذر جانا

طمع۔ دل بیتاب میں اک ہوک سی اُٹھتی ہے مر جانا + تعجب خیز ہے اپنا زمانہ سے گذر جانا

ثروت۔ نہیں ممکن ترے ناوک کو بھی دل چھوڑ کر جانا + کہ ہے دشوار صحرائے محبت سے گذر جانا

جامد۔ یہی میرے لیے گویا کہ جیتے جی ہے مر جانا + تمہارا دیر کرنا وقت وعدہ کا گذر جانا

دانش۔ ہزاروں کو یونہی دیکھا ادھر آنا اُدھر جانا + مگر پھر بھی نہ اس دُنیا کو ہم نے رہ گذر جانا

صفی۔ جب ایسی زندگانی ہو تو پھر بہتر ہو مر جانا + کسی تکلیف کا حدِ تحمل سے گذر جانا

عزیز۔ یہاں تک متصل رونا کہ آخر کار مر جانا + قیامت ہے قیامت سر سے پانی کا گذر جانا

محشر۔ وادیِ عشق تک لازم ہی مرکے بیخطر جانا ٭ کہ بند آنکھیں کیے ایک ایک منزل سے گذرجانا

اس صورت میں پڑھنے والا اچھی طرح تصفیہ کرسکتا تھا۔ کہ کس شاعر نے کونسا قافیہ اچھا کہا ہی٭ اوّل اوّل یہ رسالہ ہندوستان بھر میں شعرا کا منظورِ نظر رہا۔ لیکن امتدادِ زمانہ کے ساتھ جتنی آپس کی شکر رنجیاں بڑھتی گئیں۔ اُسی قدر اُس کی قبولیت میں کمی آتی گئی٭ علی محسن خاں صاحب آبرؔ مرحوم مدیرِ معیار گو شعر و سخن کے سچے والداد تھے۔ اور اُس کی خدمت کے لیے ہمیشہ کمر بستہ رہتے تھے۔ لیکن معیار ایسے پرچہ کا وقار قائم رکھنا اُن کی استعداد سے باہر تھا۔ جب تک قلمی امداد فراہم کرتے رہے۔ اُس وقت تک اُس کی قبولیت میں ضعف پیدا نہوا۔ مگر جب سے معاونین کا قلم رُکا۔ اُس وقت سے معیار میں ایسا ضعف پیدا ہوا کہ پھر نہ سنبھلا۔ رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ حامدؔ مغفور کی زندگی ہی میں بند ہوگیا۔ اور پھر متعدد کوششیں اُس کے جاری کرنے میں ناکامیاب ہیں٭

معیار کیوں بند ہوا٭ میری رائے میں معیار کے بند ہونے کی زبردست وجہ یہ تھی کہ آبرؔ مرحوم نے ایک مضمون کے لکھنے میں خود رائی سے کام لیا۔ جس کا ناگوار نتیجہ یہ ہوا۔ کہ بہت سے وقیع ممبر جو معیار کے سچے معین تھے کنارہ کش ہوگئے۔ اور پھر شریک نہ ہوئے۔ اگرچہ اُن لوگوں نے جنابِ حامدؔ مغفور کے اخلاقِ حسنہ اور وجاہت ذاتی کے اثر سے کھلم کھلا مخالفت نہ کی۔ مگر دلوں میں غبار باقی رہا۔

اُس مضمون کا خلاصہ یہ تھا۔ کہ اساتذۂ وقت یعنی رشیدؔ۔ عارفؔ۔ اوجؔ۔

جاوید۔ فصاحت۔ انجم وغیرہم۔ ہر شاعر سند طلب کو بغیر اُس کی قابلیت کا صحیح اندازہ کیے ہوئے ایسی سند نہ دے دیا کریں جس کا وہ مستحق نہو۔ کیونکہ ایسے اسناد سے عوام میں زبان کے متعلق غلط فہمی کا اندیشہ ہی۔ مبادا ایسے سند یافتہ شعرا کی خودساز بندشیں یا محاورات جو ادب اُردو کی حدود میں نہوں۔ دوسرے غیر مطلع اصحاب میں رواج پا جائیں اور عام ادب پر غیر صحیح اثر پڑے"۔

گو آبر مرحوم کا یہ خیال درست تھا۔ مگر میں یہ ضرور کہوں گا۔ کہ مرحوم سے تھوڑی سی غلطی ہوئی۔ اگر اُس مضمون کا رُخ فرداً فرداً اساتذہ لکھنؤ کی طرف نہوتا بلکہ عام ہوتا۔ تو غالباً کسی کو شکایت نہوتی اور معیار بھی اپنی پوری رفتار سے جاری رہتا۔

اب میں اس بحث کو ترک کر کے مطلب پر آتا ہوں۔ یعنی ماہانہ مشاعروں کے علاوہ معیار کا ایک سالانہ بہاریہ مشاعرہ ایک وسیع پیمانہ پر ہوا کرتا تھا۔ اور مصرعہ طرح کی ردیف لفظ بہار ہوتی تھی۔ موسم بہار ۲۰ جولائی ۱۹۱۲ء میں بہاریہ مشاعرہ جناب شہنشاہ حسین صاحب وکیل کے باغ میں ہوا جو گومتی پار واقع ہی۔ مصرعہ طرح یہ تھا۔

لوح معیار نظر آتی ہی تصویر بہار

اچھی اچھی غزلیں پڑھی گئیں۔ مشاعرہ کامیاب رہا۔ مشاعرہ کے قبل ہی تمام شہر میں اس مصرعہ کے چرچے تھے۔ اور واقعی طرح بھی نئی تھی۔ قریب قریب لکھنؤ میں جتنے کہنے والے تھے۔ سب نے اس طرح پر طبع آزمائی کی عام اس سے کہ شریک مشاعرہ ہوئے یا نہیں۔

معیار کا بہاریہ مشاعرہ اور رشید

رشید مغفور سے لوگوں نے غزل بھیجنے کی خواہش کی مگر اُنھوں نے غزل نہیں کہی۔ مشاعرہ کے بعد کئی مہینے گذر گئے۔ یکایک رجب کا چاند نکلا۔ لکھنؤ کے مرثیہ گویوں میں غیر معمولی سرگرمی پیدا ہوگئی۔ سامعین میں آخری تاریخوں کا شدید انتظار

شروع ہوگیا۔ حتیٰ کہ متعدد نئے مرثیے ختم ہو چکے۔ اور ہر مرثیہ کے متعلق رائے عامّہ قائم ہو چکی۔ اب چوبیس رجب کی صبح نمودار ہوئی۔ عاشقِ آلِ اطہار رکن العزا میرزا ابو علی صاحب (جن کا مشہور تعزیہ ۲۰ ربیع الاول کو اٹھتا ہے) کی مجلس کے سامان حسینیۂ اکرام اللہ خاں میں نظر آنے لگے۔ جوق جوق لوگ آ کر جمع ہونے لگے۔ اور ذاکرِ خاندانِ رسالت جناب رشید کا انتظار ہونے لگا اتنے میں پالکی نمودار ہوئی۔ رشید آئے۔ اور تھوڑا سا آرام لینے کے بعد زیب منبر ہوئے۔ مرثیہ شروع ہوا۔ ساقی نامہ ختم ہوا۔ سامعین نشۂ مضامین میں سرشار۔ ساقی کوثر کو یاد کر کے ذاکر کو مستانہ داد دلی میں داد دے رہے تھے۔ کہ یکایک رشید نے مرثیہ کا ورق اُلٹا۔ بہار آ گئی۔ گل و بلبل کے نازک تعلقات کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ گئی۔ مضامین تازہ کا رنگ مجلس پر چھا گیا۔ کہ ایک مرتبہ رشید نے بلند مگر نرم آواز میں جناب عزیز۔ جناب محشر کو یوں مخاطب کیا۔ بھئی عزیز سُنو! بھئی محشر سُنو! لوگ سمجھے کہ کوئی خاص مضمون ہے جس پر ان حضرات کی توجہ چاہتے ہیں۔ مگر رشید نے جو بند شروع کیا۔ تو معیار کے گذشتہ بہاریہ شاعرہ کی طرح میں۔ پھر کیا تھا۔ یہ دونوں بند رشید کی قوتِ غزل گوئی کا ثبوت دینے لگے۔ فرماتے ہیں۔

فصل بدلی کہ مہ تیر ہوا تیر بہار
ہیں دلِ اہلِ حسد زخمیِ شمشیر بہار
اب تو ہر شے میں نظر آتی ہے تصویر بہار
گل رگوں سے ہوا ہے بستۂ زنجیر بہار
کبھی آہستہ کبھی تیز ہوا چلتی ہے
اسی موسم میں جنوں خیز ہوا چلتی ہے
خود بہار آئی ہے کیا چیز ہے تصویر بہار
قطرے شبنم کے بنے بہرِ خزاں تیر بہار

ہوئی ہر شئی میں شریک ۔ ایسی بڑی تاثیر بہار
در کی زنجیر کا اب نام ہی زنجیر بہار

حسن پورا ہی جواں صورت جاناں ہی بہار
انتہا ہو گئی خود اپنے پہ نازاں ہی بہار

بہار یہ مشاعرہ کے قبل لوگوں کا خیال تھا اور اُس کے بعد بھی قائم رہا۔ کہ ردیف اور قافیہ کی اضافت کو سنبھالنا بہت مشکل ہی۔ لیکن رشید کی مشاقی اور خداداد طبیعت نے قافیہ و ردیف میں ایسا ربط پیدا کر دکھایا۔ کہ سبحان اللہ یہی وجہ تھی کہ تمام لکھنؤ کے شعرا ہم آواز ہو کے کہتے تھے " ہم کو سوائے رشید کے مرثیہ کے دوسرے میں مزا نہیں آتا" ذیل میں انتخاب غزلیات پیش کش ناظرین ہی۔ رشید کے پورے مجموعہ غزلیات کا طبع غیر ممکن ہی۔ ہاں اگر کسی وقت ادب اُردو کی قسمت نے یاوری کی۔ تو اُس کے چھپنے کی کوئی صورت پیدا ہو جائے گی۔

انتخاب غزلیات

مار ڈالے گی ہمیں یہ خوش بیانی آپ کی
موت کا پیغام آئے گا زبانی آپ کی

زندگی کہتے ہیں کس کو موت کس کا نام ہی
مہربانی آپ کی نامہربانی آپ کی

بعد مردن کھینچ لایا جذب دل سینہ پہ ہم
ایک انگوٹھی میں جو پہنے تھا نشانی آپ کی

رنگ عالم کا بدلنا آپ کے صدقہ میں ہی
جمع کر رکھی ہیں پوشاکیں پرانی آپ کی

نمو کی فصل جوانی کی آمد آمد ہی
کہ جا بجا سے مسکنے لگی قبا اُن کی

سا شروع اہلِ محبت کے امتحان ہونے
ابھی اُن کو ناز ہوا ہی کہ ہم جوان ہوئے

سرخ آنکھیں ہیں ابھی اُٹھے ہیں خواب ناز سے
ہاتھ ماتھے پر ہے بیٹھے ہیں عجب انداز سے

اسیران قفس آزاد ہو ہو کر نکلتے ہیں
کہ زنداں سے جنازے اُٹھتے ہیں بستر نکلتے ہیں

کروں کیوں کر نہ تعظیم اُس کی جو لائے خدا جانا
کہ اکثر ایسے ہی لوگوں میں پیغمبر نکلتے ہیں

ہوا ہی سخت مشکل دفن ہونا تیرے وحشی کا
جہاں پر قبر کھودی جاتی ہی پتھر نکلتے ہیں

قضا آتی ہی جس دم چیونٹیوں کے پر نکلتے ہیں

بہار آئی مبارک عاشق و معشوق کو ملنا
کہ کلیاں پھوٹتی ہیں بلبلوں کے پر نکلتے ہیں

نظر کے خوف سے کتری گئی ہیں اُن کی پلکیں
مری رگ رگ سے یاں ٹوٹے ہوئے نشتر نکلتے ہیں

کل جو میرے قتل پر آیا تھا خنجر باندھ کے
لے چلا ہی آج دامن میں مرا سر باندھ کے

اے مرے ہر وقت کے ایذا رساں
رہتی دُنیا تک تمہارا دم رہے

لائے ہمراہ چھری دوسری قاتل میرا
خون اغیار میں ہو جائے نہ شامل میرا

ایسے مضطر چلے اُس کوچہ کی جانب دونو
گر پڑا ہیں کبھی رستہ میں کبھی دل میرا

آہ مجنوں جو بڑھی غیظ سے لیلے نے کہا
بس بس اب اُڑنے لگا پردۂ محمل میرا

یار کے بے مہر اُنھیں بے سر و ساماں نکلا
کوچۂ زلف سے دل ہو کے پریشاں نکلا

مثل بو اپنے وطن سے میں پریشاں نکلا
جامۂ تن کو وہیں چھوڑ کے عریاں نکلا

کہتے ہیں شبنم و گل عالم نیرنگ کا حال
کوئی ہنستا ہوا نکلا کوئی گریاں نکلا

جامہ زیبوں کی ہی زینت سبب جامہ دری
گھر سے نکلا جو کوئی چاک گریباں نکلا

لازم ہی مدام غم و اندوہ و تعب کا
سنئیے تو کچھ احوال کبھی ہجر کی شب کا

چومیں گے قدم آپ جو پامال کریں گے
چھوٹے گا نہ ہم سے جو طریقہ ہی ادب کا

اے حضرت دل آنے لگی یاد جو آئی
ہر بار نہ افسانہ بیاں کیجیے جب کا

سر خم ہی مگر آنکھ مرے دل کی طرف ہی
سیکھا ہی یہ انداز نیا حسن طلب کا

تیرے سودائیوں نے رحلت کی — ہوئی ٹھنڈی لگی محبت کی

اب بھی ہے اضطراب دل باقی — لَو ہے جنبش میں شمع تربت کی

کس قدر ملتے ہیں یہ دونوں وقت — حشر کی صبح شام فرقت کی

آپ اک بے وفا سے جا کے ملے — حضرتِ دل یہ کیا قیامت کی

کیوں جھکاتے ہو ندامت سے گردن — یہی تقصیر ہے ندامت کی

لاکھ بل کھائے وقت نزع شہید — تیغ نے داد دی نزاکت کی

پائے قاتل پہ تڑپتا ہوگا — زخم ہم کھاتے ہیں قوت کے لیے

قید ہستی سے چھٹے سارے اسیران قفس — ہم بھی دو چار گھڑی اور ہیں مہمان قفس

ہاتھ کھینچے ہوئے بیٹھے ہیں اسیران قفس — کہ نہ دامانِ قفس ہے نہ گریبان قفس

دونوں عالم جسے کہتے ہیں وہ یہ عالم ہیں — صبح مرغانِ چمن شام اسیران قفس

تیلیاں توڑ کے بے کار کیے جاتے ہیں — تا نہ ہو بعد ہمارے کوئی خواہانِ قفس

.... — آشیاں بھی جو بنایا تو بعنوان قفس

آج معلوم ہوئے دل کے خیالات مجھے — تم سے حال اپنا کہا کرنے نہ دی بات مجھے

شیشۂ مے کی طرح ہچکیاں آئیں اس وقت — یاد کرتے ہیں کہیں اہلِ خرابات مجھے

یاد ایام کہ تھا دل کے تڑپنے میں مزا — لطف دیتے تھے ستم آپ کے دن رات مجھے

قبر میں سب سے زیادہ ہے یہ اے جان تکلیف — تم سے جاتی رہی امید ملاقات مجھے

لاکھوں مشتاقوں کی مٹی میں ملی ہیں آنکھیں / تیرے کوچہ میں پتہ دیتے ہیں ذرات مجھے
طالب دید سے یوں بے خبری کرتے ہیں / آپ سویا کیے آنکھوں میں کٹی رات مجھے
ہجر میں ابرِ سیہ آئے گا دکھ دینے کو / اب کے رونے ہی میں کٹ جائے گی برسات مجھے
لے دعا جاؤں کہیں حاجت پہ دعا مانگ رشید / اتنی توفیق دے اے قاضیِ حاجات مجھے

آپ کو شک ہے کہاں ٹوٹے تھے تارے رات کو / دم بدم آنسو ٹپکتے تھے ہمارے رات کو
اُن کی آرائش بھی ہوتی ہے موافق وقت کے / دن کو منہ دھویا گیا گیسو سنوارے رات کو
ٹوٹے تارے سیکڑوں یوں قدسیوں کے دل ہلے / درد سے جس وقت ہم تم کو پکارے رات کو
چونک اُٹھتے سب مری آواز جاتی دور تک / خوف تھا۔ دل میں چپک اُٹھے نالے رات کو
ہجر کی مدت نہ ہوگی ختم ثابت ہو گیا / دن کو ذرے گن چکا میں اور تارے رات کو
آگئی صبح قیامت اور میں سویا نہیں / پھر نہ آئی نیند جب سے تم سدھارے رات کو
دل جگر سینے بھر آئے صبح کو کہتے ہوئے / رہ گئے بستر پہ دو موتی ہمارے رات کو
ڈھونڈتے پھرتے ہیں دل کو صبح سے ہر سو رشید / دلربا تھا ایک پہلو میں ہمارے رات کو

گرم رفتار ہے تیری یہ پتا دیتے ہیں / دم بدم لو مرے نقشِ کفِ پا دیتے ہیں
دل کی تم بات سمجھتے ہو زباں گو نہ ہلے / خوب سنتے ہو جو چپکے سے صدا دیتے ہیں
صاف کرتے ہیں ابھی پھیر یہ وہ تیغِ ادا / دوست آکر مجھے پیغامِ قضا دیتے ہیں
جاگو اے مملکتِ عشق کے سونے والو / شب کو دربانِ دربار صدا دیتے ہیں

نظر میں خانۂ صیاد بھی ہی گلشن بھی
کہ ہم کو یاد قفس بھی ہی اور نشیمن بھی

چمن میں تھیں مجھے ساری اذیتیں جرأت
بہشت تھا مرا اُجڑا ہوا نشیمن بھی

بنا تھا کیا مرا سیلاب اشک ریگ رواں
کہ جس سے تر نہوا ایک تار دامن بھی

لگا کے کان سُنے کون التجا میری
درِ قبول کے قابل نہیں دعا میری

صدا یہ آتی ہی جنبش سے تیرے دامن کی
نسیم میری ہی گلزار میں صبا میری

یہ خوف ہی کہ میں کچھ عرض کر نہیں سکتا
مرے لبوں سے لپٹ جاتی ہی صدا میری

جفائیں سہہ کے جو رستے ترے نہیں ہٹتا
گلے سے مجھ کو لگا لیتی ہی وفا میری

وہی حیات کا باعث ہی جس پہ مرتا ہوں
وہی مرض ہی مرا اور وہی دوا میری

کون کہتا ہی کہ اور ایسا ہمیں دل چاہیے
گر عنایت ہو تو غم سہنے کے قابل چاہیے

حسرت و درد و الم اندوہ و غم پیدا کیے
دیکھیے انصاف سے مجھ کو بڑا دل چاہیے

دونو ہیں معشوق پر چھینے کو اتنا فرق ہی
آپ کو دل چاہیے بیدل کو قاتل چاہیے

ہاتھ پہلو پر دھرا ہی کرتے ہیں دلبر کی فکر
پوچھتے پھرتے ہیں گلیوں میں کسے دل چاہیے

ہر نفس جس کو زیادہ ہو تمنا قتل کی
اے مری جاں اُس کو ہر دم ایک قاتل چاہیے

طعن ساقی کی یہ ہی ہاتھ میں گو ساغر ہی
استخارہ کوئی کرے تو بہت بہتر ہی

شوق مضمون مرادوں سے کیے بڑھا دیتا ہی
ایک کلمہ کو اگر دیکھیے اک دفتر ہی

گو خزاں آ گئی باقی ہی ابھی شان بہار
گل کی پتی ہی کہ بلبل کا شکستہ پر ہی

سوئے جب گورِ غریباں میں تکلف نہ رہا
دیکھیے پاؤں کسی کا ہی کسی کا سر ہی

نہ رہا اب تو کوئی وقتِ خزاں سے خالی
جو ہوا ہی چمنِ دہر میں وہ صرصر ہی

دل ہی ڈوبے بھی ڈبوئے بھی بچائے بھی رشید
یہی کشتی - یہی دریا ہی - یہی لنگر ہی

ہر اک تربت کے گل جو میں نشانِ پائے جاناں کو
چلے دو گام جنت کر دیا گورِ غریباں کو

خدا وحشت میں برکت دے سلامت رکھے ایماں کو
کہ بسم اللہ کر کے چاک کرتا ہوں گریباں کو

تمہارے دم سے ہی اے جاں ہمارا شہر میں آنا
نہیں منظور گر تم کو نہ چھوڑیں گے بیاباں کو

مجھے جوشِ جنوں ہی لیکن اتنی ہوشیاری ہی
لپیٹے ہاتھ دامن میں بچاتا ہوں گریباں کو

گھرا ہی میکدہ پر ابر شرما کر نہ برسے گا
ذرا دم بھر نہ رونے منع کر دو اپنے گریاں کو

جو ممکن ہو تو کچھ سامانِ راحت جمع ہو جائے
پریشانی ستایا کرتی ہی تیرے پریشاں کو

نظر بازی کی کیفیت ترے قیدی کو حاصل تھی
اب آنکھیں ڈھونڈھتی ہیں روزنِ دیوارِ زنداں کو

رشید ان کو پکارا قبر سے اغیار کہتے ہیں
بتائیں کس نے باتیں ساکنِ شہرِ خموشاں کو

بیٹھ جاتے ہیں کفن آپ کے دیوانوں کے
تار دامن کے ہیں ٹکڑے ہیں گریبانوں کے

دل ہوئے ہیں ہوسِ بوسہ میں زلفوں کے اسیر
اب تو آ پہنچے ہیں نزدیک ترے شانوں کے

دل جگر پڑھتے ہیں کلمہ ترا ملکِ تن میں
ساری بستی میں یہ دو گھر ہیں مسلمانوں کے

وحشیوں کا ترے اتنا تو پتہ پایا ہی
استخواں ملتے ہیں گوشوں میں بیابانوں کے

کیا ترے نام میں تاثیر ہی سبحان اللہ
ایک دل ہو گئے تسبیح کے سو دانوں کے

شاعروں کے لیے توہین کے باعث ہو رشید
تم نہ جایا کرو مجمع میں سخن دانوں کے

ہمیں ہی جیسا تم کو جانیں ہم لوگ مرتے ہیں
ہمیں محو ادائی ہو چکی جو تم کو یاد کرتے ہیں

عجب بے رحم ہیں طفلِ حسین گلزارِ ہستی میں
گلوں کو توڑتے ہیں بلبلوں کے پر کترتے ہیں

خبر کب شانۂ و آئینہ کی تھی عہدِ طفلی میں
جوانی آگئی ہے جب سے وہ پہروں سنورتے ہیں

ذرا ہٹ جائیں سب مشغول ہوں اس وقت تنہائی
مری تربت میں وہ شانہ ہلانے کو اُترتے ہیں

جام چلنے کو ہے سب اہلِ نظر بیٹھے ہیں
آنکھ ساقی نہ چرانا ہم ادھر بیٹھے ہیں

تیرے بیتاب کبھی آہ جو کر بیٹھے ہیں
زلزلہ آگیا ہے سیکڑوں گھر بیٹھے ہیں

ظلمِ صیاد نے پرواز سے مایوس کیا
فکر میں سامنے رکھے ہوئے پر بیٹھے ہیں

صاف باطن ہوں نظر آتے ہیں مجھ کو صاف
گو ہیں پردے کے ادھر ہوں وہ اُدھر بیٹھے ہیں

دل جلے قبروں سے نکلے بھی تو کیا حاصل ہوا
بس یہی نہ گرمیٔ روزِ قیامت بڑھ گئی

ایک مدت کا ہے قصہ کسی جانب دل تھا
اب نہیں یاد یہ پہلو ہے کہ وہ پہلو ہے

سلسلہ جنبانِ وحشت ہیں نئی تدبیر سے
طوقِ منت کے بدلتے ہیں مری زنجیر سے

دل کے ٹکڑے جوڑیے یا مانہ پیچے جاکے
میری خاطر جمع ہو جائے کسی تدبیر سے

[illegible]
سیکڑوں طوفاں اُٹھے آبِ دمِ شمشیر سے

[illegible]
حالِ مشتاقانہ یہ غزل کیا جس کے میر سے

امتحان حسرتِ پرواز کا منظور جو تھا ذبح کر کے مجھے صیاد نے پر کھول دیے

جو یہ صبر اور دم بھر ترے جبر ار کرتے ابھی برق کا طریقہ فلک اختیار کرتے
غم و درد و رنج سہہ کر مجھے، دیتے ہم ولیا انھیں بے وفائیوں پر ترا اعتبار کرتے
وہ نہ آئے مر گئے ہم اگر آتے بھی تو کیا تھا یہی جان صدقہ کرتے یہی دل نثار کرتے
جو خلاف امید کے ہو تو شکستہ خاطری ہی کئی ٹکڑے دل کے ہوتے جو تم ایک بار کرتے
خبر اس کی پہلے ہوتی کہ نہ آئے گا یہ ہم کو تو رشید شعر کا فن نہ ہم اختیار کرتے

تفرقہ ڈال دیا آکے ترے تیروں نے ٹکڑے بھی اس دل صد چاک کے باہم نہ رہے
شمع گل ہو گئی کیوں پاس رہیں پروانے عشق بے کار ہی جب حسن کا عالم نہ رہے
غلمن میں سیکڑوں طوفان اٹھا کرتے ہیں تو جو منظورِ نظر چشم مری تر نہ رہے
لطفِ نظارہ پہ موقوف ہی اپنی ہستی منہ ادھر آپ نے پھیرا کہ ادھر ہم نہ رہے

اگر بھلا چاہے تو خط یار پہ مائل نہ ہو وہ پہلے بھولے جو اس سبزہ بیگانہ سے
ہم کو بعدِ دفن بھی ایسا تصور چاہیے رات بھر بالیں پہ شمع روئے جانانہ ہے
کو شوق ہیں سر کے ٹکرانے سے صحرا تنگ ہے کیا قیامت ہو اگر بستی میں دیوانہ ہے

الجھتے ہیں بازو ہوس اڑنے کی اک دل میں ہے حسرت پرواز پوشیدہ پر بسمل میں ہے
[illegible] ہیں کہ ہیں ہائے لختِ دل حلقہ حلقہ آہ ، زنجیر در محفل میں ہے

محنتِ دل کا نہ کر ذکر کہ ہے بہر سے نفرت شک
ساتھ یادِ کاروان سالار بہر منزل میں ہے

کچھ ایسے کام تھے باقی کہ ساتھ جا نہ سکے
معاف کیجیو اہلِ عدم ہم آ نہ سکے
بس ایسے حال میں عاشق کو آ پہنچی قضا
حواس جا نہ سکیں اور ہوش آ نہ سکے

ترا وحشی فقط ہے منتظر اک خندۂ گل کا
نظر اس نے حسین ہی ہاتھ رکھے ہیں گریباں پر
زلیخا حال کی اپنے خبر دیتی تھی یوسف کو
کہ جب کی آہ گھر میں۔ برق چمکی آ کے زنداں پر

گو آپ کو خدا نے جانِ جہاں بنایا
لیکن غضب تو یہ ہے نامہرباں بنایا
کہتا ہے ہاتھ اٹھا کر سوئے شجر یہ گلچیں
کیوں بدنصیب تو نے پھر آشیاں بنایا

جلوہ گر بام پہ جب مہرِ رخِ یار نہ تھا
کوئی کوچہ میں بجز سایۂ دیوار نہ تھا
تیری چلمن میں دبانے کی ادا آفت تھی
کس کا دل تھا کہ قریبِ لبِ سوفار نہ تھا

سامنے لاؤں جگر دل کو نشانہ کر کے
میں اشارہ ترا اے ناوکِ مژگاں سمجھا

تیز کرتا ہے چھری قصد اور ہے صیاد کا
اے اسیرانِ قفس وقت آ گیا فریاد کا

ہمصفیروں کی طرح سے چھوڑ کر کیا جاؤں باغ
میں ہی جوں بیدالہ چراغِ خانۂ صیاد کا

مری آنکھوں کو ہی خوں بہانا
خدا لگتی ہو تو ہشیار رہنا
پس مردن نہ ہٹے کی جبیں خاک
ترے کوچہ میں ہے بیکار رہنا

غش میں جو روز آتے ہیں ان آنکھوں سے پوچھو
کب شغل وہ مرا بستر نہیں ملتا

زبانِ تیغ سے کب گفتگو میں رہ جاتا
میں کوئی خون کا قطرہ نہ تھا کہ بہ جاتا

زاہد سا شخص بن گیا ہے میکدہ میں دُزد
چپکے سے ہاتھ جانبِ پیمانہ لے گیا

غش میں بھی تھا یار ہی کا انتظار
چونک اٹھا میں جب ذرا کھٹکا ہوا
اے رشید اشکوں کا طوفانِ عمل
دامنِ محشر بھی ہے بھیگا ہوا

بعد مرنے کے نہ آئیں باتوں سے گر باز پری
خبر ہم سے اور جنوں سے سلسلہ رہ جائے گا

بے ترے حکم نہیں یاں سے ہیں جانے والا
غیر ہے کون مجھے یاں سے اٹھانے والا

سینہ پہ جب کبھی کوئی آنسو ٹپک گیا
اس درجہ ناتواں ہوں کہ کلیجہ دھڑک گیا

جنوں ہے وجہ بقا ہم شکستہ حالوں کا
کرتا ہے خضر ہی پانی ہمارے چھالوں کا

ہیں پریشاں جمع کر کے آپ کے ارمان ہم | اچھے دل کو جانتے ہیں حشر کا میدان ہم

ٹکڑے شکستہ حال دلِ ناتواں کے ہیں | آتا نہ پوچھیے یہ مسافر کہاں کے ہیں
کیا جوڑتے ہیں آپ دلِ پارہ پارہ کو | معلوم بھی ہے کون سے ٹکڑے کہاں کے ہیں
دندانے جا بجا تری شمشیر میں نہیں | شکوے زبانِ تیغ پہ مجھ ناتواں کے ہیں

آخر شبِ غم صبح ہو جائے گی یا آئے گی موت | فیصلہ دم بھر میں ہے یا تو نہیں یا ہم نہیں

غمزہ و حسن کا یہ تفرقہ ہے | چمن میں گل ہے بلبل آشیاں میں

مجھ کو منظور ہے مرنے پہ سبک باری ہو | اور احباب کو ہے فکر کفن بھاری ہو
آتشِ حسن جوانانِ چمن بھڑکا دیں | جو گلِ سرخ کی پتی ہو وہ چنگاری ہو

کیا عجب ہے کیوں تڑپتی ہیں قفس میں بلبلیں | دیکھ اے صیاد گلشن کی ہوا آئی نہ ہو
میری چشمِ شوق کو کیا ہو گیا ہے اے رشید | اس سے لڑنا کیا کبھی جو آنکھ شرمائی نہ ہو

جی بھر کے دیکھ سکتے نہیں گل کو عندلیب | کھٹکا لگا ہوا ہے کہیں باغباں نہ ہو

آئے جو بن خاک نشین وہ قاتل اُٹھے | سیکڑوں بیٹھیں کفن سیکڑوں بسمل اُٹھے
[illegible] | [illegible] سے [illegible] اُٹھے

کیسا کوچہ ترا دنیا سے اٹھا جاتا ہوں
آج کچھ ایسی طبیعت مری گھبرائی ہے

میرے دردِ عشق سے ایذا ہی سابق خلق کو
موت بہتر ہے جو اتنا طول بیماری کرے

عشق گلیوں میں بسا پھرے لیکن نہو پردہ دری
حسن پردہ میں رہے اور گرم بازاری کرے

مجنوں نے راہِ عشق میں جیسے مرے قدم
الفت میں اتنی بات تو پیدا کرے کوئی

جو ہوا ہی صورتِ بادِ مخالف تیز ہی
دل کا میداں ہے کہ اک صحرائے آفت خیز ہی

دل کے ٹکڑے کر دیے باتیں سنا کر بزم میں
کس قدر تیغِ زبانِ یار مجھ پر تیز ہی

ہی رشید اب تنگ کیا ہ لکھنؤ مردم گیاہ
کیا زمیں ہے جو اجڑ جانے پہ مردم خیز ہی

پھر چلے پامالیِ گورِ غریباں کر چلے
کوئی سمجھے یا نہ سمجھے آپ احساں کر چلے

خاک حسرت لے گئے دل اپنے ویراں کر گئے
آپ کے دیوانے ساتھ اپنے بیاباں لے گئے

قفس میں دام میں پرواز کرنے کا یہ باعث تھا
ہوا پرواز کرنے کی ہر اک پر سے نکل جائے

جوشِ وحشت میرے تلووں کو ایذا ہی سہی
ہیں جہاں سو آبلے وہیں خارِ صحرا ہی سہی

دل میں وقتِ نزع حسرت ہے کہ دیکھیں آپ کو
مرتے مرتے خیر جینے کی تمنا بھی سہی

تیرہ بختی سے ہے شکوہ مفلسی سے ہے گلہ
اپنی وحشت سے ہے شکوہ دوسرے سے کیا گلہ

روشنی ممکن نہیں شام غریباں کیا کہے
ہم سے جب بیٹھا نہ جائے گوشہ زنداں کیا کہے

تیزی پہ اپنی تیغ کی پھر کیجیے گا ناز
آ ذکر تو ہی ہے خاک شہیدان ناز کی

پہلے گلے تو کاٹ کے دو چار دیکھیے
دامن کی سمت بھی دم رفتار دیکھیے

یاس و حسرت سے یہ دل کے گراں باری ہوئی

لاکھ من کا ہے قفس اک مشت پر کے بوجھ سے

نہ زخم تن کھلا کوئی نہ ٹپکے خون کے قطرے
رشید احباب نے کیا بے کہے رخت سفر باندھا

نہ کوئی ہنسنے والا ہے نہ کوئی رونے والا ہے
خبر اتنی تو کرتے قافلہ اک جانے والا ہے

کب تڑپے دام محبت سے رہا ہوتا ہے

کوئی سو مرتبہ مر جائے تو کیا ہوتا ہے

داغ دل خیرہ دیکھیے تو دکھاؤں تم کو

شمعیں لایا ہوں چھپا کر تری محفل کے لیے

آرزوئے شہادت کی وصیت سب سے ہے

نام لکھوا جائے میرا جب کوئی خنجر بنے

تا شام سے کچھ حال کا اپنے نہ غم ایسا
اے جوش جنوں کیوں بے کلی ہوتی ہے ہم

تا صبح میں نا رو دیا کیا غفلت پہ کسی کی
ہم تو کبھی ہنستے نہ تھے وحشت پہ کسی کی

نظر یوں اُن کی تیری سمت کو پھر پھر کے آتی ہے
کہ جیسے ہر طرف گرتا ہوا سرشار جاتا ہے

آج پھر کل کی طرح ہجر کی رات آتی ہے
دیکھیے کیا ہو رہے دل ہے رہے پہلو میں ہے

اس بے خودیِ عشق کا عالم ہی جدا ہے
جب غور سے دیکھو نہ فلک ہے نہ زمیں ہے
احباب کو ہے فکر سحر ہو تو وہ آئیں
یاں صبح کے ہونے ہی کی اُمید نہیں ہے

دامِ گیسو سے جو چھوڑا تو گذر جائیں گے
عاشقِ زلف اسی رات کو مر جائیں گے
وہ نہلاتے ہیں تو کہتے ہیں بگڑ کر گیسو
چھوڑیے چھوڑیے ہم آپ سنور جائیں گے

ہم گئے دُنیا سے لاکھوں دل کے ارماں رہ گئے
تھے جو تم کو یاد وہ بھی عہد و پیماں رہ گئے
کون اپنے خون کا قاتل سے دعویٰ کر سکا
ہاتھ اُٹھ کر سیکڑوں سوئے گریباں رہ گئے
ناتوانی یہ بتا دے کس سے چاہوں گا مدد
گر اُلجھ کر ہاتھ میں تارِ گریباں رہ گئے
قتل گہ میں پاؤں سے نادر ٹھکرایا گیا
ایک سر پر سیکڑوں قاتل کے احساں رہ گئے

کانپ اُٹھتا ہوں جو محفل میں چھلکتا ہے جام
میں تو واقف ہوں کہ مینا ہی کی بدولت دل ہے

رشید اور مرثیہ

رشید نے میدانِ مرثیہ گوئی میں جلد سے جلد اس وجہ سے قدم رکھا۔ کہ اول تو یہ نانہال کی میراث تھی۔ ثانیاً یہ کہ کوئی دوسرا ذریعہ ایسا نہ تھا۔ جو آئندہ اُن کی اور اُن کے متعلقین کی معاش کا سبب ہوتا۔ سوچے کہ عشق و تعشق کے دورانِ حیات میں حصولِ کمال کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ چنانچہ مختصر مختصر متعدد نئے مرثیے تصنیف کیے۔ اور عشق مغفور کو دکھائے۔ جو موضوعاتِ شاعری کے اُس وقت بہتر سے بہتر جاننے والے تھے۔ دوسرے تعشق مرحوم کے خداداد رنگِ کلام نے رشید پر کچھ ایسا اثر کیا۔ کہ بغیر اصلاح لیے اُن کے کلام میں تعشق کی نازک خیالیوں کی بو آنے لگی۔ ماسوا اس کے خود بھی طباع تھے۔ اس وجہ سے جدّت طبع کے میدان میں دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگے۔ مگر یہ زمانہ گویا صرف مشق ہی مشق کا تھا۔ گو کبھی کبھی عشق یا تعشق کی پیش خوانی بھی کر دیتے تھے۔ اور لکھنؤ والوں کے سامنے اپنی آئندہ بہار کے نمونے پیش کر دیتے تھے۔

نفیس و رشید

اب وہ وقت آیا۔ کہ عشق کا انتقال ہوا۔ تعشق نے وفات پائی۔ جدھر دیکھتے ہیں کوئی کفیل نظر نہیں آتا۔ چار و ناچار طبیعت پر زور ڈالا۔ اور حیثیت مرثیے کہہ کے پڑھنے کی کوشش کی۔ مگر اُدھر شیرِ انیس اپنی پوری آواز سے گونج رہا تھا۔ یعنی نفیس کے کلام کا سکہ دلوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ کوئی معمولی بات نہ تھی کہ عوام میدانِ سخن میں جس قدر کی نظر سے نفیس کو دیکھ رہے تھے۔ اُس کا عشر عشیر بھی کسی دوسرے کا حصہ ہو سکتا۔ ساتھ ساتھ مشکل یہ بھی تھی۔ کہ جو راہیں مرثیہ گوئی میں۔ انیس کا قلم پیدا کر گیا تھا۔ اُس کی پابندی بھی ناگزیر تھی۔ کیونکہ انیس کی آواز کا اثر ابھی محو نہ ہوا تھا۔ اس لیے کوئی دوسرا رنگ مطبوعِ عوام نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر کوئی متنفس انیس کے رنگ سے علاوہ کسی دوسرے رنگ کو

اختیار کرتا بھی تو بے سود۔ وہی مرثیہ۔ وہی چہرہ۔ وہی سحر۔ وہی خاندانِ رسالت۔ وہی واقعاتِ کربلا۔ وہی لڑائی۔ وہی نتیجہ۔ اور ان سب کا ایک بہتر کہنے والا نفیس موجود۔ پھر رشید کو دفعتاً اتنی قبولیت کہاں سے ہو جاتی +

لیکن رشید بھی سمجھتے تھے۔ کہ اگر نیا مرثیہ لکھنؤ میں پڑھا جائے۔ تو ایسا تو ہو جس کو لوگ اچھا نہ کہیں تو بُرا بھی نہ کہیں۔ لہذا جو مرثیہ کہا اُس میں اپنی انتہائی قوت صرف کی۔ اور ایسے مصرعہ نکالے کہ زبان زدِ عوام ہونے لگے۔ رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچی کہ جہاں ۲
مرثیہ گوئی کا ذکر ہوتا۔ تو نفیس کے ساتھ ساتھ رشید کا نام بھی ضرور لیا جاتا +

بہ حیثیت مرثیہ گو رشید کی شہرت کا پہلا سبب

اس قدر جلد رشید کی مرثیہ گوئی میں شہرت کا باعث۔ مؤلف کی رائے میں دوسرے اسباب کے ساتھ اُن کا ایک مشہور غزل گو ہونا بھی تھا۔ جب تک نفیس زندہ رہے رشید بیشتر مشاعروں میں شریک ہوتے رہے۔ اگر نفیس کا نام مرثیہ گویوں کی فہرست میں اوّل تھا۔ تو رشید کا نام بھی غزل گوئی میں فرد لیکن چونکہ رشید نے اپنی قوت غزل گوئی سے مضامین مرثیہ گوئی میں کام لینا شروع کر دیا تھا۔ لہذا اُن کی برق مثال طبیعت نے بھی اپنا کام کیا۔ اور جدت خیال اور چستی زبان کے ایسے ایسے انمول نمونے پیش کیے۔ جنہوں نے رشید کو رشید بنا دیا اور سامعین کے دلوں میں قدر کرا دی +

اب رشید میدانِ مرثیہ گوئی کی پہلی منزل طے کر کے۔ شہرت کے اُس نمایاں مقام پر پہنچے۔ جہاں سے یہ صدائیں آنے لگیں " رشید نے کیا زبان اور کیا طبیعت پائی ہے" عوام کی اس قدر افزائی نے رشید کا دل ہاتھوں بڑھا دیا۔ اور متواتر مشقِ سخن نے اُن کو زبانِ انیس کا مستحق وارث منوا دیا۔ چنانچہ اس رباعی میں خود بھی تفاخرانہ فرماتے ہیں

رباعی

ہی عشق کا رنگ ہر سخن میں میرے	لاکھوں گلِ مضموں ہیں چمن میں میرے
مشتاق کلام انیس کا مجھ سے سنیں	گویا ہی زباں اُن کی دہن میں میرے

عروج — رسم زمانہ ہی کہ جب تک اہلِ کمال کی ترقی کے اسباب فراہم نہیں ہوتے اُس وقت تک اُس کا جوہر نہیں کھلتا۔ مگر جس وقت ایک حد تک زمانہ روشناس ہو جاتا ہی تو پھر اُس کو مزید مدد کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ بلکہ دوسرے اُس سے مستفیض ہونے لگتے ہیں۔ اور یہ قانون فطرت ہی کہ ہر شئے کو ابتداءً مدد کی ضرورت ہوتی ہی۔ اور ایک وقت ایسا بھی آتا ہی کہ پھر احتیاجِ مدد نہیں رہتی۔ مثلاً ایک پودا جس کی کونپلیں پھوٹ رہی ہوں باغبان کی دستِ تربیت کا محتاج ہوتا ہی۔ مگر جب اُس کو پوری نشو و نما ہو جاتی ہی۔ تو وہی باغبان ثمرِ محنت پاتا ہی۔ اور جھولیاں کی جھولیاں بھر لیتا ہی۔ یہی حال عوام کا ہی کہ ایک زمانہ تک درختِ کمال کو پرورش کرتے ہیں۔ پھر اُس کے سایہ میں بیٹھ کر فرحتِ روحانی حاصل کرتے ہیں۔ یعنی جہاں وہ گمنامی کے تاریک پردہ سے نکلا۔ اُس کے فیوضات عوام میں پھیلنے لگے۔ اور اُس کا نہ مٹنے والا نام دُنیا کی لوحِ دل پر محفوظ ہونے لگا +

فیوضاتِ کمال — آج ہم دیکھتے ہیں کہ دُنیائے نظم و نثر میں جو اہلِ کمال کوس لمن الملکی بجا چکے ہیں۔ اُن کے بعد کی آنے والی نسلوں نے۔ اُن کے کمال سے کیسے کیسے درس لیے ہیں۔ میدانِ سخن میں دیکھیے تو کہا جاتا ہی۔ کہ فلاں شخص میر کا رنگ کہتا ہی۔ فلاں غالب کی ترکیبوں کا دلدادہ ہی۔ فلاں داغ کا اتباع کرتا ہی۔ فلاں طرزِ مرثیہ میں انیس کا پیرو ہی۔ فلاں دبیر کا +

نثر کو لیجیے تو کہتے ہیں۔ فلاں شخص آزاد کی سی عبارت لکھتا ہی۔ فلاں شبلی کا

چہرہ اُتارتا ہے۔ فلاں کی عبارت میں رنگینیٔ شعر رہی +

اگر ان لوگوں کو زمانہ نے املا یہ کی لات کا موقعہ نہ دیا ہوتا۔ تو آج کتاب ادب میں سادے ورق نظر آتے اور وہ بھی بے رونق +

لکھنؤ میں جہاں انیسؔ اور دبیرؔ تھے وہاں ایک تیسرا اگرچہ مختصر گروہ عشقؔ کے ماننے والوں کا بھی ضرور تھا۔ اور یہ حضرات بھی دوسروں کی طرح اپنے پسندِ خاطر ذاکر کے خاندان سے محبت رکھتے تھے +

چنانچہ ایک شخص مرزا عبد العلی نامی اشرف آباد میں رہتے تھے۔ اور عشقؔ مغفور کے فدائیوں میں تھے۔ اُن کی مجالس میں۔ سوائے خاندانِ عشقؔ کے دوسرا ذاکر زیبِ ممبر نہ ہوتا تھا۔ عشقؔ مرحوم نے بڑے بڑے معرکہ آرا مرثیے اُن کی مجالس میں پڑھے۔ اُن کے بعد تعشقؔ مرحوم کے لیے وہی ممبر زینۂ شہرت بنا۔ اور اب آخر میں رشیدؔ کی باری آئی۔ اور اُن کا فرض ہوا۔ کہ اُس آبائی ممبر کے وقار کو اپنے بزرگوں کی طرح برقرار رکھیں۔ چنانچہ بعد وفات تعشقؔ مرحوم۔ رشیدؔ نے ابتدائی نہیں بلکہ آزمائشی مجلسیں اشرف آباد میں پڑھیں +

ان مجالس کے مجمو ں کا اندازہ۔ اس سے ہوسکتا ہے۔ کہ انیسؔ، دبیرؔ، مونسؔ عشقؔ، تعشقؔ، وحیدؔ۔ دُنیا سے اُٹھ چکے تھے۔ نفیسؔ کا آخری زمانہ تھا۔ لوگ ہمہ تن گوش تھے۔ کہ کوئی نئی آواز ممبر سے بلند ہو۔ اور گذشتہ اہلِ کمال کے انتقال کے بعد اُن کے اشتیاقِ سماعت کو مطمئن کرے۔ کہ یکایک رشیدؔ کی اُبھرتی ہوئی طبیعت نے اُن کی شاعرانہ دلچسپیوں کے برقرار رکھنے کا وعدہ کیا۔ اور آخر عمر تک اُس کی پابندی کی

بہار و ساقی نامہ

رشید کی زبان تو جیسی تھی ویسی تھی۔ اُنھوں نے طرزِ مرثیہ میں طباعی سے کام لیا۔ اور واقعی اس کی ضرورت بھی تھی۔ وہ جدت یہ تھی۔ کہ اُنھوں نے مرثیہ کے مقررہ مضامین میں سے ایک گوشہ نکالا۔ اور وہاں غزل کے چُلبلے مضامین۔ اس خوبصورتی سے صرف کیے۔ کہ مرثیہ کا ایک نیا جزو ہوگئے۔ وہ کیا۔ وہ ساقی نامہ اور بہار۔ رشید کے ہر مرثیہ میں ساغر و گل سے اوکا۔ وہ بہار دکھانے لگے۔ کہ رشید نے مضامینِ غزل اُست ہو ہو کر داد دینے پر مجبور ہوئے۔ اب کیا تھا۔ اب رشید کو بہار کلام کا رستہ مل گیا۔ سامعین کو مُستِ خیال کر دینے کی راہیں معلوم ہوگئیں۔ بہار کہی اور یوں کہی۔

بہار

گل و بلبل میں جو باتیں ہیں ذرا گرم	آنکھ نرگس کی جھکی جاتی ہے اندری شرم
اس قدر فصلِ بہاری نے کیا ہے آزرم	خواب مخمل کی طرح ہوگئے ہیں کانٹے نرم

ایک قسم مخمل نرم

پھل ملا بلبلِ نالاں کو شکیبائی کا
پھول ہے داغ جگر لالہ صحرائی کا

جب سُنی پائے نسیم سحری کی آہٹ	اُٹھنے کو سبزۂ خوابیدہ نے بدلی کروٹ
ہر طرف کھلنے لگے باغ میں غنچے چٹ پٹ	اُٹھ گئے سارے عروسانِ چمن کے گھونگٹ

دل کھلے فصلِ گزشتہ کا تاسف نہ رہا
اب ذرا بھی گل و بلبل میں تکلف نہ رہا

ساقی نامے کہے، یوں کہے۔

ساقی نامہ

ہم ازل سے مئے اُلفت کا پیا کرتے تھے جام
عہدِ طفلی میں بھی رہتا تھا اسی کام سے کام
اُسی صورت سے ہوئی ختم جوانی کی شام
صبحِ پیری ہے صبوحی کا ہے ساقی ہنگام

نزع میں تیری محبت کا بھریں دم ساقی
غیر کچھ کھا کے مرے پی کے مریں ہم ساقی

مئے اُلفت تری دل میں ہے کہ شیشہ میں پری
اس کی مدحت سے تو اسلام کی کھیتی ہے ہری
رہتی ہے جس کی ثنا سے لبِ کوثر پہ تری
کبھی ہوتی نہیں مستوں کو تری بے خبری

ایسے مے خوار ہیں دن رات پیا کرتے ہیں
ہم تو سوتے میں ترا نام لیا کرتے ہیں

دھو دیا ابر نے رحمت کے مرا دامنِ تر
نہیں تیری مئے اُلفت سے کوئی شے بہتر
میں تو ہرگز نہ پیوں گو کہ ملیں سو ساغر
میرے نزدیک تو ہے ہیچ شرابِ کوثر

نہرِ فردوس ہے کیا مے کا خزینہ ساقی
تیرے ماتھے کی شکن میں ہے پسینہ ساقی

ساقیا حد کا گنہگار تھا یہ عبدِ ذلیل
سچ کہوں خلد میں جانے کی نہ تھی کوئی سبیل
مئے اُلفت تری ہاتھ آگئی بخشش کی دلیل
آئے تھے غصہ میں بالیں پہ مرے عزرائیل

پینے والا ہے مرے ساتھ کا یہ جان گئے
منہ مرا دیکھتے ہی ہنس دیئے پہچان گئے

اگرچہ رشید کے قبل کے مرثیہ گویوں نے اس شعبہ کو بالکل نظر انداز نہیں کیا تھا

تو زیادہ اہمیت بھی نہیں دی تھی۔ انیس و دبیر کے یہاں بہار اور ساقی نامے پائے جاتے ہیں۔ مگر مختصر اور شاذ۔ زمانہ کی رفتار کے ساتھ رشید کی پختہ کاری بھی ترقی کرتی گئی۔ کم از کم ہندوستان کے تمام شیعی حلقوں میں مشہور ہوگئے۔ اور جا بجا سے طلب ہوتے رہے +

سچ تو یوں ہے کہ رشید مرثیہ میں بہار اور ساقی نامہ کے موجد تھے۔ اور ان مضامین کو مرثیہ کے ہر حصہ میں کھپا دینے کی اس قدر حیرت انگیز قوت پائی تھی۔ کہ جہاں چاہتے تھے بے تکلف ساقی کو پکار دیتے تھے جس موقع پر چاہتے تھے چمن آرائی کرنے لگتے تھے۔ اور کچھ ایسے اسلوب سے کہ سننے والے یکایک متحیر ہوکے بلند آواز میں داد دینے لگتے تھے +

قابل غور یہ امر ہے کہ ذیل کے بندوں کے پہلے جناب عباس کے نہر پر تشریف لانے کا ذکر کرتے چلے آتے ہیں۔ اور سامع کو یہ گمان بھی نہیں گذرتا کہ عنقریب ساقی نامہ شروع ہونے والا ہے۔ کہ یکایک رشید یہ مصرعہ پڑھتے ہیں ع نہر پر جائیں گے ہم تھوڑا سا پانی لینگے + اور ساقی نامہ کی یوں ابتدا ہوجاتی ہے۔ کہ

ساقیا نہر پہ سقائے حرم جاتا ہے		کچھ برا رنگ زمانہ کا نظر آتا ہے
ہوگئی فکر سوا نشہ جو کم پاتا ہے		جلد دے جام پہ پیکش ترا جلاتا ہے

نشہ ہو صاف تو اعدا کی صفائی لکھوں
خوب لڑ جائے طبیعت تو لڑائی لکھوں

ناتواں پیر ہوں تن گھل گیا غم سے کل کے		ساقیا پھول ہوئی جام ہوں ہلکے ہلکے
پینا منظور ہے منہ تیرے قدم سے مل کے		ہو یہ ساماں تو مری عمر کا ساغر چھلکے

ہی بہت ضعف اسی نشہ کے سہارے پہنچوں
آنکھ ہو بند تو کوثر کے کنارے پہنچوں

یا (مدحِ عباس کے لشکر کا علم دار ہوں ہیں) اس مرثیہ میں اوپر کے بندوں میں سفرِ شہیدِ کربلا سے تمام عالم کے متاثر ہونے کا ذکر کرتے کرتے۔ ذکرِ گل و بلبل اس مصرع سے چھیڑ دیتے ہیں (کچھ تو ہو روح کو فرحت کہ عجب عالم ہی) اور مضامین بہار سے سامعین کے دلوں میں ایک تازہ لہر پیدا ہو جاتی ہی۔

اور ہی رنگ ہوا آگئی گلشن میں بہار
زلفِ سنبل کی ہوئی مشک فشاں عنبر بار
یوں ہوا دوڑی کہ تھرائے چمن کے اشجار
کر دیا سبزۂ خوابیدہ کو جلدی بیدار

دل پہ قابو نہیں بیتاب نظر آتی ہیں
بلبلیں شاخوں پہ خاجا کے اُتر آتی ہیں

جس طرف دیکھو زمانہ کی بہار آئے نظر
یاسمن واں ہی تو عالم ہی یہاں سوسن پر
درمیاں میں ہی جو سورج مکھی اُس کی ہی خبر
دوپہر بیچ میں ہی صبح ادھر شام اُدھر

صنعتِ صانعِ قدرت کو کوئی کیا بدلے
یہ نہ بدلیں گے اگر لاکھ زمانہ بدلے

مرثیہ کو رشید کی حیثیت سے دیکھئے۔ اور داد دیجیے۔ وہ ساقی نامہ اور بہار کے موجد تھے۔ اور کسی شئ کا موجد اُس کو اپنی زندگی میں اتنا درجۂ کمال تک نہیں پہنچا سکتا۔ کہ اُس کی تکمیل آئندہ کامل کُن ہاتھوں کے احسان سے بے نیاز رہے یعنی آنے والے اہلِ نظر اُس کے کمزور پہلوؤں کو درست نہ کریں +

تاریخِ ادب میں ہمارے سامنے ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ جن میں نقشِ اول سے

نقش ثانی سبقت لے گیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے۔ آزاد سے پہلے تذکرہ نویسوں نے شعرا کے تذکرے لکھے اور مقبول بھی ہوئے۔ مگر آج ہم تذکرۂ آبِ حیات کو جن خوبیوں سے مملو پاتے ہیں پیشتر کے تذکرے اُس سے معرا ہیں +

رشید اور فکرِ سلیم

اگر رشید کی فکرِ سلیم بہار اور ساقی نامہ کے ایسے صحیح اندازہ پہنچ گئی تھی کہ اُس کے آگے خاتمہ نظر آتا ہے۔ اُن کے دورانِ حیات ہی میں مرثیہ گویوں نے بہار اور ساقی نامہ میں اُن کا اتباع کرنا شروع کر دیا۔ اور بڑی بڑی کوششیں کیں۔ مگر رشید کی بہار اور ہی رنگ دکھاتی ہے۔ اور اُن کے ساقی نامہ کی کچھ اور ہی شان نظر آتی ہے۔ آیندہ صدیوں میں بھی کہنے والے بہار اور ساقی نامے کہیں گے۔ مگر اُس وقت کی موجودہ نقاد نظروں کا یہ پہلا کام ہوگا۔ کہ رشید میں اور اُن میں فرقِ امتیازی نکال لیں۔

رشید کی شہرت کا دوسرا سبب

جناب رشید کی مرجعیت عامہ کا یہ دوسرا سبب تھا۔ جو اوپر بیان ہوا۔ انھوں نے موجودہ نسل کے کانوں کو بہار اور ساقی نامہ کا اس قدر عادی بنا دیا ہے۔ کہ اب یہ کیفیت ہے۔ ادھر مرثیہ خواں کو منبر پر صرف تھوڑا سا عرصہ گذرا کہ سامعین بیا بے چینی کے ساتھ بہار یا ساقی نامہ کے مضامین کا انتظار ہونے لگا۔ بلکہ گویا جس مرثیہ میں ان دونوں میں سے کوئی ایک چیز نہیں وہ مرثیہ ناکمل کہلاتا ہے +

یہ سب کچھ تھا۔ مگر نفیس زندہ تھے۔ رشید ایک ممتاز مرثیہ گو تھے۔ اور مرجع عوام بھی۔ لیکن بعد وفاتِ نفیس رشید اور ہی رشید ہو گئے تھے۔ اگرچہ اس جاں گزا حادثہ نے بظاہر خاندانِ انیس میں مرثیہ گوئی کا خاتمہ کر دیا تھا۔ کیونکہ نفیس کے بعد اُن کے نواسہ میر علی محمد صاحب عارف مغفور مرثیہ کہتے تھے۔ مگر اُس وقت ابتدا تھی۔ لہذا نظریں نہیں پڑتی تھیں۔ لیکن بعد کو جناب عارف بھی مشہور ہوئے اور

انیسؔ و نفیسؔ کا کمال اُن سے زندہ رہا۔ رہے رشیدؔ اُن کو نفیسؔ سے اتنا تعلق ضرور تھا۔ کہ ماموں تھے۔ اور بس۔ نہ اُن کے کمال سے ان کے خاندان کو وجہِ تفاخر ہو سکتا تھا۔ نہ اِن کے کمال سے اُن کے خاندان کو۔ اُن کا رنگِ سخن الگ۔ ان کا جُدا۔ مگر زبانِ انیسؔ ضرور مشترک تھی۔ چنانچہ بارہا رشیدؔ مرحوم نے نفیسؔ مغفور سے کہا "ماموں جان اُردو میری مادری زبان ہو" اور اُن مغفور نے جواب دیا "ہاں میاں سچ کہتے ہو"

رشید
عارف

نفیسؔ کے بعد عارفؔ مغفور نے زمانہ کو اپنا معرف بنایا۔ اور خوب خوب فرمایا اس مقام پر اتنا لکھ دینا ضروری ہو۔ کہ جہاں تک لفظ مرثیہ گوئی۔ اپنے اصلی معنوں میں مستعمل ہو سکتی ہو۔ کہا جا سکتا ہو۔ کہ عارفؔ مغفور بھی بہت کامیاب رہے۔ عارفؔ مغفور مرثیہ رونے رُلانے کے لیے کہتے تھے۔ اس سے کسی کی تفریحِ خاطر مقصود و منظور نہ تھی۔ شانِ مرثیہ قائم رکھنے میں وہ اپنے پرنانا انیسؔ کے پورے پورے پیرو تھے میں یہ نہیں کہتا کہ رشیدؔ نے مرثیہ گوئی کا حق ادا نہیں کیا۔ بلکہ یہ کہتا ہوں کہ عارفؔ مغفور نے زبانِ انیسؔ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مصائب پر زیادہ نظر ڈالی۔ میں ایک حد تک ماننے کو تیار ہوں کہ رشیدؔ کے مرثیے سلاست۔ محاورہ۔ نزاکتِ خیال جدتِ تخیل کے بہترین نمونے ہیں اور یہ خوبیاں عارفؔ کے یہاں کم سہی۔ مگر مرثیہ جس کا نام ہو وہ عارفؔ کے کلام میں بہت پایا جاتا ہو۔ رشیدؔ نے بھی اکثر مرثیوں میں۔ ایسی شانِ مرثیہ قائم رکھی ہو کہ جس کا جواب نہیں۔ چنانچہ منجملہ اور مرثیوں کے اُن کا یہ مرثیہ جس کا مطلع ہو۔

"شاہ پر مارِیہ میں ابرِ الم چھانے لگے"

اُن کی بہترین تصانیف میں ہے۔ اور جس کا حصۂ مصائب ایسا ہے کہ اُن کے دوسرے مرثیوں میں اُس کی نظیر کم ملے گی۔ بہر حال رشید نے بھی مصائب پر خوب خوب نظر ڈالی۔ مگر چونکہ بہت شوخ طبیعت پائی تھی۔ اس وجہ سے سادگی پسند نہ آتی تھی۔ جو بات کہتے تھے اُس میں ایک بات پیدا کر دیتے تھے۔ برخلاف اس کے مصائب کے لیے سچے واقعات اور پر اثر الفاظ کے سوا جدتِ تخیل یا نازک خیالی کی چنداں ضرورت نہیں۔

حاصلِ کلام یہ کہ رشید و عارف اس دورِ آخر میں انیس کا نام روشن کر گئے اور اپنے اپنے رنگ میں بادشاہی کی۔ یہ ملکہ خدا نے انیس ہی کو عنایت فرمایا تھا کہ اُن کے یہاں شوخی اور شانِ مرثیہ دونوں حصے برابر کے پائے جاتے ہیں۔ اور یہ خوبی اُس شاعرِ فن کے خصوصیات میں سے ہے +

انیس و نفیس | انیس کے بعد نفیس مرحوم نے باپ کا نام ایسا ہی روشن کیا جیسا ایک صاحبِ کمال کا قابل فرزند کر سکتا ہے۔ لیکن چونکہ نفیس مغفور کی استعداد علمی کا دائرہ بہت وسیع ہو چکا تھا۔ فلسفہ۔ منطق۔ ادب۔ عربی و فارسی میں اچھی دستگاہ بہم پہنچ چکی تھی۔ مفتی میر عباس صاحب شوستری کے چشمۂ علوم سے کافی سیراب ہو چکے تھے اس وجہ سے کلام نہایت چست و مضبوط۔ صنائع و بدائع سے مملو۔ لطائف شعری ہر پہلو سے مکمل۔ اس پر طرہ یہ کہ باوجود اس قدر استعداد کے کلام میں ثقالت کا بالکل پتہ نہیں۔ خلاصہ یہ کہ ایک باخبر شاعر تھے۔ اُن کی زبان بھی انیس کی زبان سے جدا نہ تھی۔ فرق اتنا تھا کہ نفیس انیس کی اُردو اپنی زبان سے ادا کرتے تھے +

اس تمام تمہید سے میری غرض یہ تھی کہ انیس کے بعد اُن کے نام کو برقرار رکھنے والے مونس و وحید نفیس رشید عارف جلیس تھے۔ جب تک اردو کا آخری لفظ

ہندوستان کی آیندہ نسلوں کی زبان پر جاری رہے گا۔ ان بزرگواروں کا نام بھی دوسرے محسنین زبان کے ساتھ ساتھ دُنیا نہ بُھلا سکے گی۔

خاندان انیس کے نوجوان مرثیہ گو۔ اس وقت مروّج۔ فائق۔ حسن۔ قدیم۔ ہیں۔ جن سے آئندہ نامِ انیس برقرار رہنے کی اُمید کی جاتی ہے۔

طرز مرثیہ خوانی

ظاہر ہے کہ شعر میں وقتی اثر پیدا کرنے کے لیے شاعر کو پڑھنے کا سلیقہ اچھا معلوم ہونا چاہیے۔ جس کے بغیر بدل ماتحلل غیر ممکن ہے۔ خصوصًا مرثیہ کے لیے لازمی ہے۔ اس لیے کہ واقعات کا نقشہ کھینچنے کے لیے حرکات یا طرز ادا ناگزیر ہیں۔ اور شاید مرثیہ کے علاوہ کسی اور صنفِ سخن کو طرزِ ادا کی چنداں ضرورت نہیں۔ اور مرثیہ کے لیے اس لیے ضروری ہے کہ اُس میں کا بیشتر حصہ رزم اور اُس کے لوازمات سے مملو ہوتا ہے۔ مثلاً تیور توڑے کا بانکپن۔ نیزہ بازی کی ادا۔ تیر اندازی کی دھج۔ پیدل کے ٹھاٹھ۔ سوار کے ہاتھوں کی صفائیاں۔ بچاؤ کی پھرتیاں۔ اسپ برق رفتار کی چمک۔ نیچوں کی لچک تلوار کا کاٹ۔ لڑائی کے گھمگھاٹ۔ ایسی چیزیں ہیں۔ جن کو عملی اظہار کا جامہ پہنانے کی سخت ضرورت ہے۔ یہ مانا کہ ان سب کا نظم کرنے والا ہر صنف کے مناسبات کو انتہائی کوشش سے صرف کر کے دکھاتا ہے۔ مگر جس وقت پڑھنے بیٹھے گا۔ اُس وقت اُس کو احساس ہو جائے گا کہ کہہ لینا اور شے ہے۔ اور ادا کرنا دوسری چیز۔ انیس کے متعلق پڑھا بھی ہے۔ اور ان کے سُننے والوں سے سُنا بھی۔ کہ وہ مغفور اپنے پڑھنے کے ذریعہ سے کلام کا حسن دوگنا نہیں بلکہ چوگنا کر دکھلاتے تھے۔ اُن کے بعد کے مرثیہ پڑھنے والوں میں مختلف پڑھنے کے طریقے ایجاد ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ اس وقت کے ہنرمند مرثیہ پڑھنے والے جناب سید خورشید حسن صاحب مروّج ہیں۔ اور جن کو بحمد اللہ

مرجعیت عوام بھی حاصل ہے۔ اُن کی طرزِ مرثیہ خوانی سب سے جُدا ہے اور خوب ہے۔

رشید سیدھا سادا پڑھتے تھے

مرثیہ پڑھنے کے لیے وجاہت خاص اور آواز مناسب زیادہ درکار ہیں۔ رشید نہ تو ایسے قوی الجثہ تھے۔ اور نہ فطرت سے آوازِ بلند عطا ہوئی تھی۔ پھر مرثیہ خاطر خواہ کیونکر پڑھ سکتے۔ دوسرے یہ کہ وہ پُرانے دفتوں کے لوگوں میں سے تھے۔ منبر پر بیٹھ کر جسم کو غیر معمولی حرکت دینا ہی قبیح سمجھتے تھے۔ اکثر فرماتے تھے کہ انیس کا پڑھنا بہت مہذب تھا۔ وہ صرف آواز کے اُتار چڑھاؤ اور اشارات سے کام لیتے تھے۔ آج کل کے پڑھنے والے تو منبر کی چولیں ہلا دیتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ رشید بہت نرم لہجہ میں سیدھا سادا پڑھتے تھے۔ اور خود بھی کہتے تھے "میں اس سے بہتر مرثیہ نہیں پڑھ سکتا"۔

واقعی مرحوم سرِ منبر اپنے کلام کی سچی داد لیا کرتے تھے۔ جس میں طرزِ ادا کا بالکل لگاؤ نہ ہوتا تھا۔ اہلِ مجلس کے اشتیاق کی یہ صورت ہوتی تھی۔ کہ ہمہ تن محوِ سماعت ہے۔

قدرشناسی

ایک مرتبہ کا ذکر ہے۔ کہ شدید گرمیوں کا زمانہ ہے۔ آفتاب نصف النہار پر ہے۔ اور رشید چوبیسویں رجب کو امام باڑہ اکرام محل میں نیا مرثیہ پڑھ رہے ہیں۔ گرمی کی یہ حالت کہ تمام اہلِ مجلس پسینہ میں عرق عرق۔ دستی پنکھے چل رہے ہیں۔ مگر پھر بھی بمصداق "بادزن دست بدست ہمہ۔ وز دمِ او باد بدست ہمہ" تسکین نہیں ہوتی ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں انسان کیونکر اطمینان سے سُن سکتا ہے۔

رشید نے بھی رنگِ مجلس پہچان لیا۔ اور اختصار کرتے کرتے۔ ایک دفعہ مرثیہ روک کے فرمایا "پنکھے رکھ دیجیے۔ اور یہ تین چار بند سُن لیجیے" سبھوں نے فوراً پنکھے رکھ دیئے۔ جس سے رشید کے کمال اور سامعین کی قدر افزائی اور کمال شناسی کا اندازہ ہوتا ہے۔

لکھنؤ اور اہل کمال دورِ آصفی

آصف الدولہ کے وقت سے لکھنؤ میں ترقی علوم و فنون کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ اور واجد علی شاہ مرحوم کے قیام تک ختم ہو جاتی ہے۔ اگرچہ غدر کے زمانے سے موجودہ وقت تک بھی اہل کمال افراد کے وجود کا سلسلہ جاری نظر آتا ہے۔ مگر وہ وقت ہی اور تھا۔ اور یہ وقت اور ہے۔ لکھنؤ میں اُس وقت کمال کی جو قدر تھی اُس کو زمانہ جانتا ہے۔ آصف الدولہ کی نگاہ قدر شناس نے یہ گوارا نہ کیا۔ کہ اہل کمال کو اُن کی خدمتوں کا صلہ نہ ملے۔ اور اشرفیوں کے توڑوں پر مہریں لگی رہیں۔ سخاوت کا عام مینہ برسایا۔ اور یوں برسایا۔ کہ اُس کی بوچھار اودھ کے گرداگرد تک پہنچی۔ اور لوگ پھولے پھلے نظر آنے لگے۔

ایک عجیب سنگدلی

اسی دور سے متعلق فیاضی کے ضمن میں یہ واقعہ بھی کہن سال لوگوں کی زبانوں پر درجہ تواتر رکھتا ہے کہ ایک مرتبہ والی نواب ہاتھی پر رونق افروز اپنی رعایا کی مختلف حالتوں کو اُن کی صورتِ حال سے مشاہدہ کرتا ہوا جوہری بازار سے گزر رہا تھا۔ شان یہ تھی کہ آگے آگے نہ نوکر چاکروں کی گرجتی ہوئی آواز۔ نہ صدائے دورباش نہ ماہی مراتب۔ نہ پیش و پس جلوس۔ پھر کیا تھا۔ جو وقار شاہی کو نمایاں کرتا۔ اور جان نثار رعایا کو آدابِ شاہی بجا لانے کی طرف متوجہ کرتا۔ نہیں انہیں شان و شوکت شاہی کی علامت تھی اور ضرور تھی۔ وہ یہ کہ چند سفید پوش چوبدار دست بستہ ہمراہِ رکاب مگر خاموش۔ کہ اتنے میں ہر طرف سے ایک نرم آواز آئی کہ ہاتھی روکو۔ فیلبان نے فوراً تعمیل ارشاد کی۔ پاؤں کی حرکت روک دی۔ انکس ترچھا کر دیا ہاتھی تھما۔ ارشاد ہوا کہ دیکھو وہ بڑھیا جو سڑک کے کنارے کھڑی ہے کیا چاہتی ہے۔ چوبدار دوڑا۔ دیکھا کہ ایک عجوزہ ایک لوہے کا ظرف لیے کھڑی ہے۔ جس کا رخ

نواب کے ہاتھی کی طرف ہے۔ چوبدار نے پوچھا یہ کیا کرتی ہے۔ اور کیا چاہتی ہے۔ اس نے کہا: میں نے سُنا تھا۔ اگر بادشاہ کی نظر لوہے پر پڑ جائے۔ تو سونا ہو جائے۔ میں غریب مفلس ہوں۔ سُنا تھا کہ آج بادشاہ کی سواری نکلے گی۔ اپنے مقدر کی آزمائش کے لیے یہاں کھڑی ہو گئی۔ کہ دیکھوں میرا لوہا بھی سونا ہو جاتا ہے یا نہیں ؛

چوبدار نے واپس آکر یہ حکایت ہو بہو تمام ہمایوں تک پہنچائی۔ حکم ہوا کہ وہ ظرفِ آہن اشرفیوں سے بھر دیا جائے۔ حکم کی دیر تھی۔ اس بڑھیا کو خزانۂ شاہی تک ہاتھوں ہاتھ پہنچوا دیا گیا۔ جہاں اُس کے ظرفِ آہن پر سنگِ پارس کا عمل کیا گیا +

" اے آصف الدولہ کاش یہ لکھنؤ تمہارے بعد کسی دوسرے نام پکارا جاتا "

علوم و فنونِ قدیمہ کے انحطاط کو ہندوستان میں ایک صدی سے زیادہ کا عرصہ گذرتا ہے۔ مگر لکھنؤ اور حیدرآباد میں اُن کا تنزل سست رفتار سے جاری تھا اور ہے۔ حیدرآباد اگر اسی حالت پر قائم بھی رہتا تو جائے تعجب نہ تھا۔ کیونکہ بفضلہ وہاں کے اولوالعزم نواب اپنے ملک و قوم کی بہتری کو ہمیشہ مدِنظر رکھتے چلے آئے ہیں۔ اور علوم و فنون کے معین رہتے ہیں۔ مگر لکھنؤ کے لیے یہ امر باعثِ فخر ہے کہ باوجود اسبابِ تنزل پیدا ہونے کے یہ سرزمین کاملین کو پیدا کرتی ہے۔ اور اسی طرح شاید پیدا کرتی رہے گی میں یہ نہیں کہتا کہ لکھنؤ میں ہوائے کمال ایک ہی طرح چلتی رہی - ہاں تغیر ہوا اور ضرور ہوا۔ درختِ کمال کی شادابی کے ذرائع بالکل مفقود ہو گئے۔ اس حالت پر بھی شگوفے پھوٹے۔ مگر اس زمینِ خشک کی فطرتی تری اُن کے رنگ و بو کو اچھی طرح اُبھارنے میں ناکافی ثابت ہوئی۔ بلکہ بہت سی کمزور کلیں زمانہ کی گرم ہوا کی تاب نہ لا سکیں اور نکل نکل کے مرجھا گئیں۔ چارہ کیا تھا۔ یہ منہ ہوا ہندکی قسمت +

لکھنؤ کمال شناس جیسا پہلے تھا۔ ویسا ہی اب بھی ہی۔ مگر زمانہ سے مجبور ہی۔ کمالات کی عملی قدر نہیں کر سکتا۔ لیکن کمال حاصل کرنے والے افراد مستعد ہیں باوجود اس کے کہ بے زری کا ایک بھاری پتھر اُن کی راہ روکتا ہی۔ مگر اُن کی رفتار جاری ہی۔ اور اپنی جگہ یہ سوچ کے مست ہیں۔ کہ

سخی کا اگر ہاتھ پورا نہ اُٹھا　　فقیروں کا یوں بہی بھلا ہو رہا ہی

اب لکھنؤ اہلِ کمال کی کان ہی۔ کانِ زر نہیں۔ جو قابلِ قدر نفوس اس وقت ہیں غنیمت ہیں۔

ذیل میں رشید کے چند مرثیوں کا انتخاب ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہی۔

انتخاب مراثی

(مطلعوں کی فہرست)

خلق میں موردِ الطافِ الٰہی ہے علی

(بند ۱۱۴۳) در حالِ امام حسینؑ

دہمِ ماہِ محرم کو قیامت آئی — شبِ عاشور گئی صبحِ شہادت آئی
سپہِ شام سے تیر آئے یہ نوبت آئی — پیشوائی کو قضا تا درِ دولت آئی
مستعدِ مرگ پہ ہر صفدر و غازی اٹھا
کہ مصلّے سے محمد کا نمازی اٹھا

طلوعِ صبح بہار

آمدِ صبح تھی اللہ کی قدرت کا ظہور — محو تھے طاعتِ معبود میں سب وحش و طیور
نظر آنے لگی ہر چیز جو نزدیک و دور — جیسے سیل آتی ہے اس طرح سے بڑھتا تھا نور
آشنا بحرِ سماوات کے سارے ڈوبے
موجزن نور کا دریا ہوا تارے ڈوبے

قدرتی منظر — لطافتِ نظم

وہ ہوا سرد وہ سامانِ سحر چار طرف — اوس کھائے ہوئے شاخوں میں ثمر چار طرف
وہ نہائے ہوئے سارے گلِ تر چار طرف — شب کے بھیگے ہوئے شبنم سے شجر چار طرف
جس نے جس جا کا کیا قصد وہیں پر پہنچا
کثرتِ گل سے نہ اک قطرہ زمیں پر پہنچا

اب ہیں[?] سیدھے وہ شجر غم سے جو تھے کاہیدہ — دیکھنے نرگس نے عجائب وہ جو تھے نادیدہ
گل ہیں چپ[?] جیسے ہو معشوق کوئی فہمیدہ — برگِ گل سایہ میں یا لب ہیں مسی مالیدہ
دفعتاً ہو گیا ہر ایک چمن جائے بہار
پھیل کر سایہ ہوا خیمۂ لیلائے بہار

ایسی سیرابی[?] میں ہے نہیں جس کا ثانی — اس میں پوشیدہ کسی بحر کی ہے طغیانی

صفحہ دھویا ہوا ہو کھینچے جو نقشہ مانی
گل کی پتی بھی گرے تو نکل آئے پانی
سرخ پھولوں سے عیاں خون ٹپکنے کو ہے
ساغرِ گل سے مئے رنگ چھلکنے کو ہے

داغِ الفت نہیں بلبل کے جگر پر بھی ہیں گل
سب زمیں پر بھی جا بجا ہر ایک شجر پر بھی ہیں گل
سرِ دیوار بھی گل باغ کے در پر بھی ہیں گل
اب تو گل پاؤں کے نیچے نہیں سر پر بھی ہیں گل
ایسی کثرت کبھی دیکھی نہ سنی پھولوں کی
آسماں بن گیا پھولوں کا زمیں پھولوں کی

ہیں نمو مندِ شجر باغ میں تیاری ہے
ہر شجر آئینہ ہو یہ حکم نیا جاری ہے
آج کل فصلِ بہاری بھی گرسیاری ہے
عکس سے باغ کے دیوار پہ گلکاری ہے
منہ نقابوں سے ہیں سب اہلِ حیا کھولے ہوئے
گل ہوا کھا رہے ہیں بندِ قبا کھولے ہوئے

امام حسینؑ جدائی انصار پر اظہار ملال فرماتے ہیں اور وہ جانثار جواب دیتے ہیں

باجے بجتے ہیں صف آرا ہے اُدھر لشکرِ شام
ہیں طلبگارِ رضا گرد ہیں انصار تمام
بیٹھے ہیں کرسیٔ زریں پہ شہِ عرش مقام
آپ منہ دیکھ کے ایک ایک کا کرتے ہیں کلام
اب ذرا دھیان نہیں ہے مری غمخواری کا
بھائیو تم کو تو دعوےٰ ہے وفاداری کا

چھوڑتے ہو مجھے اس وقت میں تم لوگ یہ کیا
ہم نکم تھے انہوں نے کبھی قدموں سے جدا
عرض کرتے ہیں وہ اے عزتِ اربابِ وفا
آج عزت ہے اسی میں کہ ہوں آقا پہ فدا
خلق میں لاکھ برس کا بھی جو سن آئے گا ٭ اس سے بہتر نہ کوئی مرنے کا دن آئے گا

شہادت عزیز بعد تنہائی حسین

بعد انصار عزیزوں کی جو باری آئی / شاہ کو حیدرِ صفدر کی وفا دکھلائی
آج تک ذکر ہے یوں سب نے شہادت پائی / چھٹ گئے بھانجے فرزند بھتیجے بھائی
دو پہر کو کوئی مونس تھا نہ شیدائی تھا
بس فقط آپ تھے اور عالمِ تنہائی تھا

امام خیمہ میں تشریف لاتے ہیں اور عالم تنہائی میں بیبی جناب زینب سے ہمکلام ہوتے ہیں

رو کے ارشاد کیا اے مری غمخوار بہن / مجھ سے سب چھوٹ گئے میرے مددگار بہن
کوئی دم اور ہوں میں بیکس و ناچار بہن / اب مرے حلق پہ چلنے کو ہے تلوار بہن
وقت آتا ہے وہ نزدیک کہ لٹ جاؤ گی
جلد مجھ بیکس و ناچار سے چھٹ جاؤ گی

محبت خواہر جناب زینب کا جواب

بولیں پیارے ترے بھائی ترے صدقے جاؤں / خشک ہیں پھول سے لب پانی کہاں سے لاؤں
دل کا جو حال ہے اس وقت کسے دکھلاؤں / چل کے میں تیرے عوض برچھیاں رن میں کھاؤں
پھر وہی رونقِ گلزارِ محمد ہو جائے
مجھ کو موت آئے مگر تیری بلا رد ہو جائے

امام عالی مقام گہوارۂ علی اصغر کے قریب آتے ہیں اور پیاس سے جاں بلب دیکھ کر اس شش ماہے کو طلب آب کی غرض سے میدان میں لانے کا قصد فرماتے ہیں۔

ماں کی محبت فرزند شیرخوار

کہا بانو نے بہت خوب ہے شاہِ دلگیر / لیکن اک عرض کروں عفو ہو میری تقصیر
رن میں ہے دھوپ کڑی اور مرا بچہ ہے صغیر / دوسرے آتے ہیں فوجِ ستمگار سے تیر
شہ نے فرمایا کہ خود تیرِ ستم کھاؤں گا
ان کو دامن میں چھپائے ہوئے لے جاؤں گا

میدانِ ظلم اور سوالِ آب

نکلے خیمہ سے عجب یاس میں سلطانِ انام
دشت میں ایک بلندی پہ کیا آکے مقام
لیکے ہاتھوں پہ بڑھا یا طرفِ لشکرِ شام
کھول کر منہ علی اصغر کا کیا شہ نے کلام
اک سنِ دیکھ لیں اور سوکھے ہوئے لب دیکھیں
تم میں جو صاحبِ اولاد ہیں وہ سب دیکھیں

شہادت علی اصغر اور امام حسین کے انتہائے جگر خراش

رو دیئے بعض پشیماں ہوئے بعضے بے پیر
حرملہ سے پسرِ سعد نے کی یہ تقریر
رنگ اچھا نہیں کر قطع کلامِ شبیر
اُس ستمگر نے بڑا ظلم کیا مارا تیر
باغِ جنت میں دلِ فاطمہؑ سے تیر چھدا
حلق اصغر کا چھدا بازوئے شبیر چھدا

منقلب ہو گیا ہاتھوں پہ جو وہ غیرتِ ماہ
صبر نے روک لیا آ گئی تھی لب تک آہ
دیکھ کر حرملہ کی سمت کہا آپ نے واہ
یہی لازم تھا یہی چاہیے سبحان اللہ
تشنہ لب آئے تو آب اُس کو یوں ہی دیتے ہیں
پانی جو مانگے جواب اُس کو یوں ہی دیتے ہیں

کہہ کے یہ اصغرِ ناداں کو سنبھالا شہ نے
رو دیئے لیکن بہت کیا زور سے نالا شہ نے
غیظ آیا تھا کیا رحم کہ ٹالا شہ نے
ناوک اُس ننھی سی گردن سے نکالا شہ نے
نکہتِ غنچۂ گل تھی کہ چمن سے نکلی
روح بھی تیر کے ہمراہ بدن سے نکلی

کر کے تیار لحد رو دیئے بہت سرورِ دیں
فاتحہ پڑھ رہے تھے بادشہِ عرش نشیں
ٹیک کر تیغ کمر سے ہو گئے اُٹھ کے جو ہیں
بولے تربت کی طرف دیکھ کے دل تنگ ہیں
تم گئے ہم بھی ہیں دنیا میں مسافر اصغر * مرنے جاتے ہیں خدا حافظ و ناصر اصغر

امام آمادۂ جنگ ہوتے ہیں

کہہ چکے یہ تو نظر مُڑ کے سوئے لشکر کی
غیظ دیکھا تو سپہ شام کی پیچھے سرکی
ہوگئی اور ہی کچھ شکل شہ صفدر کی
ہاتھوں سے جھاڑ کے مٹی لحد اصغر کی
دل بے تاب کے ٹھہرانے کو سینا پوچھا
زُلفیں آراستہ کیں مُنہ کا پسینا پوچھا

توصیف اسپ

لگی جو مہمیز چلا اشہب ہوا وہ سن سے
باگیں گو روکتی تھیں لپٹی ہوئی گردن سے
نہ خبر بھی ہوئی تا چرخ گیا یوں رن سے
رُوح مومن کی نکل جاتی ہے جیسے تن سے
تیز تگ کون ہے ہنگام تگ و دَو ایسا
اپنے نعلوں پہ نہیں بوجھ سبک رَو ایسا

سارے اس رخش میں ہیں باغ بہاری کے اصول
پاؤں اس لطف سے رکھتا ہے کہ کھل جاتا ہے پھول
یہ فرس وہ ہے کیا ہے جسے مسرت نے قبول
آتے ہی فصل بہار اور ہی کچھ تھے معمول
دیکھنے سے قدم اس رخش کا دریا نکلا
نعل کیا اس کے بندھے پاؤں سے کانٹا نکلا

توصیف ذوالفقار [illegible] عباس علمدار

غور سے دیکھیے ہے شوق وغا اس کا نام
ہاتھ قبضہ پہ جو رکھا تو اُگل آئی حسام
نصرت شاہ میں کرتی تھی اُسے عمر تمام
میان کو کاٹ کے نکلی کہا بس ہے کیا کام
مرد میداں جو ہو کیا کام ہے گھر سے اُس کو
چھپ کے جو بیٹھے بہادر نہیں کہتے اُس کو

ناگن آمادہ ہوئی زہر اُگلنے کے لیے
خون میں ڈوبی ہے رنگت کے بدلنے کے لیے
رُوحیں تیار ہیں جسموں سے نکلنے کے لیے
راستے صاف ہوئے جانے میں چلنے کے لیے
جاتی ہے جس کی طرف دوڑ کے وہ گرتا ہے
جس طرف پھرتی ہے یہ دست قضا پھرتا ہے

جوہرِ تیغ ہی یا سینہ کے زخم آئے ہیں
دل ہیں یاں سوزِ غمِ شاہ کے چھالے ہیں
دوش پر گیسوئے پُر پیچ بکھر ڈالے ہیں
ہار پھولوں کے ہیں یا موتیوں کے مالے ہیں

سارے اس سیف میں جوہر ہی سراسر نکلے
تیغ کیا نکلی فقط میان سے جوہر نکلے

دل کو مرغوب جو ہیں جوہرِ تیغ بُرّاں
اس کی خواہش میں گرے پڑتے ہیں سب پیر و جواں
دیکھ کر اس کو ہمیشہ رہے اعدائے جاں
ان دکانوں پہ رہا خوب ہی سودا ارزاں

یہ وہ بازار ہی جا دل نے جسے کھولا ہی
تیغ یہ وہ ہی یداللہ نے جسے تولا ہی

ہی گراں ایسی سنبھلتی نہیں جس کی جھوکیں
تیز دم ایسی کہ سو کوہ نہ جس کو روکیں
شیر دل ایسی بگڑ جائے جو اعدا ٹوکیں
سربلند ایسی کہ چبھتی ہیں فلک میں نوکیں

جاں ستاں ایسی کہ جینے کی قسم لیتی ہی
جانیں لے لیتی ہی اعدا سے تو دم لیتی ہی

جب گیا وا ہر ایک اہلِ دغل بیٹھ گیا
یہ پڑا بوجھ کہ سب فوج کا دل بیٹھ گیا
بولی غصے سے اجل جب کوئی یل بیٹھ گیا
بے حیا کھانے کو تلوار کا پھل بیٹھ گیا

کیا عجب ہے جو دستِ شہِ صفدر اُٹھے
خلق باقی نہ رہے فتنۂ محشر اُٹھے

ڈھونڈتے ہیں سب اسے کچھ ایسی ادا آتی ہی
ہٹتی ہی پاس سے جب یہ تو قضا آتی ہی
تازیانے اجل کو سکھا آتی ہی
اور اک ہاتھ ہمیں پر یہ صدا آتی ہی

برچھے کے آب اس کی بلاخیز ہوئی جاتی ہی جو بازو سے چل کے ہوا تیز ہوئی جاتی ہی

رضا بقضائے ایزدی

محو تھے جنگ میں کفار سے سلطانِ انام لائے جبریل امیں وصل خدا کا پیغام
ملک الموت نے پہلو سے کیا جھک کے سلام نیند آنے لگی یہ قلب کو آیا آرام

نشۂ عشق بڑھا سرورِ اکرم جھومے
دل کو جوش آگیا سلطانِ دوعالم جھومے

قتل حسینؑ پر حالت جناب زہرا

لائے تشریف میں پر جو شہِ عرش پناہ آپ کے پالنے والوں کو ہوا غم جاں کاہ
دوڑے جبریل امیں کہتے ہوئے بسم اللہ باغِ فردوس میں نکلی دلِ زہرا سے آہ

چشم انور سے بہائی ہوئی خون ناب گئیں
قصر میں احمدِ مختار کے بے تاب گئیں

عرض کی دوڑیے جلدی کہ قیامت آئی آپ کے پیارے نواسہ نے شہادت پائی
کہا حیدر سے غم و رنج کی بدلی چھائی یا علیؑ جلد خبر لو ہے دمِ تنہائی

اُس سے لللہ نہ اس وقت جدا ہو صاحب
وقتِ مشکل کا ہے تم عقدہ کشا ہو صاحب

بولیں شبرؑ سے کہ بھائی کی مدد کو جاؤ ساتھ کھیلے ہو دل اس وقت ذرا بہلاؤ
اے مری جان اگر قصد ادھر کا پاؤ زخم کاری ہیں سنبھالے ہوئے پاس لاؤ

نہ ہو نزدیک بہن جان جو کھونے کے لیے
کہو صدقہ گئی ماں آتی ہے رونے کے لیے

اُس کے جینے کی مجھے صبح سے باقی نہیں آس ساتھ جو لوگ تھے سب آگئے وہ میرے پاس
ہو چکے اُس سے جدا قاسم و اکبر عباس جب سے آیا علی اصغر مجھے دونی ہوئی یاس

عاشق زار بہن رنج سے مرتی ہوگی ✱ ہائے کیا جانیے کیا اُس پہ گذرتی ہوگی

ہے ارضِ کربلائے معلّی جوابِ عرش

۱۲۰ بند (در حالِ امام حسینؑ)

وقارِ ارضِ مقدسہ

ہے ارضِ کربلائے معلّی جوابِ عرش — ہر ذرہ اس زمیں کا ہے آفتابِ عرش
پائے نہ اس کی گرد کو بھی آب و تابِ عرش — جس کا غبار اُڑ کے ہوا ہے حجابِ عرش
وہ جائے فخرِ جنتِ عنبر سرشت ہے
کیونکر کہوں بہشت کہ رشکِ بہشت ہے

صفتِ آستانۂ روضۂ مقدسہ

روشن ہے آستانۂ شبیر کس قدر — چوکھٹ کسی کو صاف جو آتی نہیں نظر
کہتے ہیں ایک نور کا خطہ زمین پر — ہاں ہے یہ حدِ روضۂ سلطانِ بحر و بر
اعدا نہ آنے پائیں یہاں کید کے لیے
زنجیرِ در بنی فقط اس قید کے لیے

تعریفِ زنجیرِ بست

زنجیرِ بست دیکھ کے کرتے ہیں سب بیاں — یہ موجِ بحرِ عفو ہے لیکن نہیں رواں
یہ بھی ہے ایک معجزۂ شاہِ انس و جاں — ہوتا ہے دور سے خطِ پیچیدہ کا گماں
بولا یہ جس کو کاہکشاں کا گماں ہوا
لوحِ جبیں سے خطِ مقدر عیاں ہوا

توصیفِ حوض

تسنیم دیکھے حوض تو ہو قصدِ ترکِ لاف — کوثر سے لاکھ درجہ ہے بہتر خطا معاف
ہیں سب کنارے صورتِ آئینہ خشک و صاف — پیاسے موئے ہیں یہ ہے اُمت نہیں خلاف
ہے طور حوض میں مئے بخشش کے جام کا
دھوکا ہے نہریوں پہ لبِ تشنہ کام کا

کلس و گنبد

جنبش نہیں کلس کو یہ ہے شاہ کا ادب — گنبد یہ ہے جھک کے ٹھہرتی نظر کب

سمجھے ہیں اُس کو قبۂ نورِ الٰہ سب — پہلے یہ تھا سفید مطلّا ہوا ہی اب
نقشہ ہی بحرِ قدرتِ حق کے حباب کا
اُس کو رنگا ہی کاٹ کے رنگِ آفتاب کا

پردہ

پردہ چھپا ہوا ہی نئی ہر مثال ہی — منہ پر حریر کے دامنِ رنج و ملال ہی
دامانِ والدین کا سب کو خیال ہی — اُڑتا ہی کب . یہ وجد سے فرحت کا حال ہی
پردہ بندھا ہی کب نہ گئی عقل ایک کی
پیچیدہ فرد رکھی ہی اعمالِ نیک کی

روشنی

ہر شب کو روشنی کا سماں ہی کہ واہ وا — قندیل میں چراغ ہیں کس درجہ خوشنما
سینہ میں جس طرح ہو دلِ عارفِ خدا — شمعیں بھی ہاتھ اُٹھائے ہوئے ہیں پئے دعا
عرصہ ہوا ہی پیاس میں شہ کو مرے ہوئے
ہیں ہر لگن میں شمع کے آنسو بھرے ہوئے

ضریحِ انور

ہی جلوہ گر ضریحِ شہنشاہِ بحر و بر — زائر بیان کرتے ہیں آپس میں دیکھ کر
ہیں جالیاں کہ آنکھیں ہیں پیاسی بہ نظر — گویا کہ دیکھتا ہی بعینہ کوئی اودھر
شبیر تیر کھا کے مرے یہ نشان ہی
جسمِ مشبکِ شہِ والا کی شان ہی

مصائبِ کربلا و شہادتِ حسین

دسویں کی صبح تک تھے عزیز و اقربا — کم سوزِ دل تھا شاہ کا دربار گرم تھا
ناگاہ ایک ایک سے ملنے لگی قضا — کوئی رہا نہ پاس بجز ذاتِ کبریا
ساری بضاعتِ شہِ ابرار لُٹ گئی
تھی دوپہر قریب کہ سرکار لُٹ گئی

تنہا جو قاتلوں میں ہے اُس سے پوچھیے
جو سو طرح کے ظلم سہے اُس سے پوچھیے
خوں جس کا بے گناہ بہا اُس سے پوچھیے
مومن جسے کوئی نہ کہے اُس سے پوچھیے
شق ہو نہ ہائے جس سے وہ ایذا گزر گئی
آقا پہ ۔ سوچیے تو سہی ۔ کیا گزر گئی

آئے درِ خیام پہ شاہنشہِ انام
چلّا کے بیکسوں کو کیا آخری سلام
ہر سمت حشر ہو گیا دوڑے حرم تمام
زینب نے آگے بڑھ کے کیا دو سے کلام
خیمہ میں آکے مجلسِ ماتم کو دیکھ لو
ہم تم کو بھائی دیکھ لیں تم ہم کو دیکھ لو

اہلِ حرم کو تعلیمِ صبر اور سید سجاد کو تلقینِ اسرارِ الٰہی۔

مُنہ کو پسر کے کان کے نزدیک لائیے
کیں کچھ وصیتیں تو کچھ اسرارِ حق بتائے
کچھ اپنے دل کا حال کہا زخمِ تن دکھائے
کہہ کر اُٹھے لعینوں سے تم کو خدا بچائے
جب ہو اکیلے دل پہ بہت جبر کیجیو
خالق ہی ساتھ صابروں کے صبر کیجیو

ظلمِ اعدا دیکھ کر جنابِ زینب بھائی سے کس یاس کے الفاظ میں فرماتی ہیں

کیا کیا ہمارے بارے میں فرما گئے رسول
افسوس جلد بھول گئے ظالم و جہول
پوچھے کوئی کہ ظلم و ستم سے ہے کیا حصول
اچھا انھیں ہماری حکومت نہیں قبول
حاکم نہیں یہ فاطمہ کی بیٹیاں تو ہیں
ہم شاہزادیاں نہیں سیدانیاں تو ہیں

خیالِ جدائی برادر سے حضرت زینب کو غش آگیا

زہرا کے نورِ عین نے دامن کی دی ہوا
جھک کر بہن بہن جو کہا ہوش آ گیا
جلدی سے آنکھیں کھول کے بولیں بہن فدا
تدبیر کیا کروں کہ نہ تم مجھ سے ہو جدا

حاضر عوض تمہارے یہ بنت بتول ہے
بچ جاؤ تم تو مجھ کو شہادت قبول ہے

رخصت ہونا حسینؑ کی پیاری بیٹی سکینہ

اس ذکر میں سکینہ نے بڑھ کر کیا بیاں — مرنے کا قصد کر لیا کیا اے شہ زماں
فرمایا ہاں خدا کی قسم اے پدر کی جاں — وہ کیا کرے نہ جس کا ہو ناصر نہ مہرباں
بولیں بچا کے ظلم سے اعدا کے بھیج دو
بابا ہمیں مزار پہ نانا کے بھیج دو

اہل حرم سے رخصت ہو کے شاہ عالی جناب عازم جنگاہ ہوتے ہیں

عزم جنگ

گھوڑے کے پاس آئے شہنشاہ لاجواب — جبریل نے سوار کیا تھام کر رکاب
بیٹھے فرس پہ تن کے تو پیری بھی تھی شباب — آیا دم زوال بلندی پہ آفتاب
دیکھا سپاہ شر کو غضب کی نگاہ سے
صاف آئی الاماں کی صدا رزم گاہ سے

توصیف فرس براق شکست خرام

رکھا جو ہاتھ باگ پہ بجلی بنا فرس — چاہا بہت ہوا نے تن اُس کا تو مَس
چاروں قدم براق کے رفرف کا پیش و پس — اُڑ جاتا عرش تک جو نہ کھینچتے حسینؑ بس
اُس گرم رو کے نقش قدم ہیں جو راہ میں
گویا چراغ جل رہے ہیں رزم گاہ میں

یہ قصد ہے دبوں گا نہ فوج شقی سے میں — تلوار کیوں کھینچے صف اُلٹ دوں ابھی سے میں
تھم جاؤں گا اشارۂ شاہ جری سے میں — جز سبط مصطفےٰ نہ رکوں گا کسی سے میں
اُس سربلند سے ہے زمانہ دبا ہوا
دانتوں میں غیظ سے ہے دہانہ دبا ہوا

چلتا ہے مثلِ تیغِ دو دم وقتِ داروگیر — آتا ہے رن میں تیر سا گو آرہے ہیں تیر
اُڑتا ہے برچھیوں نیزوں سے کوڑکے ہیں شریر — سینہ سپر ہے بہرِ شہنشاہِ بے نظیر
کَسنے میں سر کو دُم سے ملایا ہے جان کے
کھنچنے میں یوں ملیں گے نہ گوشے کمان کے

توصیف تیغِ آبدار

تیغِ علیؑ ہے اور کمرِ شاہِ خوش خصال — لو وسطِ آسماں میں نظر آتا ہے ہلال
ہے یہ شگون کہ فوجِ ستم ہوگی پائمال — جان اب نہیں بچے گی یہ سب کو ہوا خیال
سوئے سقر ہر ایک عدو دوڑنے لگا
مضطر ہوا رگوں میں لہو دوڑنے لگا

دُنیا میں صورتِ تن و جاں ہیں نیام و تیغ — گویا ہوں۔ تو زبان و دہاں ہیں نیام و تیغ
گل اور بوئے باغِ جناں ہیں نیام و تیغ — قلب و ولائے شاہِ زماں ہیں نیام و تیغ
دشوار ایک دم ہے ٹھہرنا نیام میں
پنہاں ہے جوہروں میں کہ ماہی ہے دام میں

معرکہ حسینؑ سے فوجِ عدو کا حال تباہ

اُکھڑے پڑے ہیں جتنے نشاں تھے گڑے ہوئے — دریائے فوجِ شر میں تلاطم ہیں بپے ہوئے
ہیں بے حواس بدر و اُحد کے لڑے ہوئے — سردار سارے کانپ رہے ہیں کھڑے ہوئے
ہیبت سے ابنِ سعد کا دل پائمال ہے
خیمہ میں ڈر سے دوڑ رہا ہے یہ حال ہے

ایک پہلوان جنگ آزما آنا اور حسینؑ کے ہاتھ سے مارا جانا

فوجیں جھپٹ گئی ہیں کھڑے ہیں امامِ دیں — پر غیظ سے چڑھائے ہیں کرتہ کی آستیں
واں جب یہ پونچھتے ہیں رُخِ پاک و جبیں — اُس پہلواں نے ظالموں کی منتیں جو کیں
کہہ کے چلا کہ سہل سے سر کاٹ لاؤں گا ہو مشکل کوئی پڑے گی تو میں بھاگ آؤں گا

چمکا کے منھ کو سبطِ نبی نے دکھائی تیغ ۔ جھجکا لعیں کہ شاہِ امم نے لگائی تیغ
چمکی پلک کہ تا بہ زمیں جا کے آئی تیغ ۔ یہ بھی خبر اُسے نہ ہوئی کس نے کھائی تیغ

اُس میں بھرا نہ خون ستمگار دو ہوا
کیا ہاتھ صاف تھا مع رہوار دو ہوا

وقتِ شہادت قریب ہے شاہِ دل فگار یادِ اعزا و انصار فرماتے ہیں کیا بیکسی کا عالم تھا۔

فرمایا مجھ حزیں کی دعا لیں کہاں ہیں آئیں ۔ میری خبر برائے خدا لیں کہاں ہیں آئیں
قلب و جگر سے نیزے نکالیں کہاں ہیں آئیں ۔ گرتا ہوں مجھ کو جلد سنبھالیں کہاں ہیں آئیں

آفت کا سامنا ہے مصیبت کا وقت ہے
ہیں کس طرف رفیق رفاقت کا وقت ہے

جواں ہوئے علی اکبر جہاں سے جانے کو

بند ۱۶۰ (در حالِ علی اکبرؑ)

جناب علی اکبرؑ کا سراپا

بلائیں لیتی ہے چہرہ کی زلفِ عنبر بو — سفیدۂ سحرِ عید ہے بیاضِ گلو
ہزار آئنے صدقہ وہ مہ لقا پہلو — بھرے ہیں زورِ علی سے بھرے بھرے بازو
حسد کا نام بھی جس میں نہیں وہ سینہ ہے
فدا ہے جس پہ دلِ شاہِ دیں وہ سینہ ہے

ہیں سب کی آنکھوں کے تارے سبھوں کے راحتِ جاں — حدیث سے بھی خبردار حافظِ قرآں
نمازِ شب کے بھی پابند خوب مسئلہ داں — ستارہ۔ چاند سے ماتھے پہ سجدہ کا ہے نشاں
عیاں تمام قیافہ سے شہ رسالت کا
رگوں میں خون کی جا مادہ امامت کا

حضرت علی اکبرؑ کی جوانی اور فنونِ جنگ کی مشق ان کا استفسار اور اس نوجوان کی ... شجاعت آمیز جواب

طریق جنگ و جدل کے چچا سکھانے لگے — ہر ایک کو قدر اندازیاں دکھانے لگے
ہوا جو شوق دل اعدا کے زخم کھانے لگے — ریاض جتنے کیے تھے وہ سب سکھانے لگے
اُمنگ دل کی جوانی کے ساتھ بڑھنے لگی
کمان کھنچنے لگی آستین چڑھنے لگی

جو پوچھتی تھی کبھی بانوئے امامِ زماں — یہ کیا سبب ہے کہ ہوتا ہے جنگ کا ساماں
تو عرض کرتے تھے یہ دست بستہ اے اماں — تمام اہلِ جہاں ہیں فدائے شاہِ زماں
عوض میں شاہ کے شمشیر و تیر کھائیں گے
لہو پدر کے پسینہ پہ ہم بہائیں گے

ماں کی شاباش

وہ کہتی تھیں کہ مرے وضعدار کیا کہنا — سپاہیوں کو جراحت ہے پھولوں کا گہنا

اور قبیلۂ بنی ہاشم کی شجاعت کا اظہار

امید دل کی بر آتا ہے خون کا بہنا ہمیشہ سینہ سپر آگے باپ کے رہنا
جو تم نے پائی ہے عزت وہ کس نے پائی ہے
یہ بات وہ ہے جو کنبہ میں ہوتی آئی ہے

بعد شہادت جناب عباس حضرت علی اکبر رخصت میدان چاہتے ہیں اور امام حسین غم آگیں جواب دیتے ہیں۔

پھرے جو لاشۂ عباس سے امام انام قدم پہ گر کے لگے رونے اکبر گلفام
کہا حسین نے کیوں کیا ہے پسر گل اندام یہ جان تک ہے نثار آئے گر تمہارے کام
وطن سے دور ہوں آفت نصیب ہوں بیٹا
جہاں کا شاہ ہوں اور یوں غریب ہوں بیٹا

کہا انہوں نے کہ ہیں آپ صاحب ہمت میں چاہتا ہوں کہ اب مجھ کو دیجیے رخصت
تڑپ رہا ہوں پئے سیر گلشن جنت رہی نہ تاب جو دل کو تو بول اٹھے حضرت
خیال مرگ تو اے میرے لال ہے تم کو
پدر ضعیف ہے یہ بھی خیال ہے تم کو

ہمارا حق بطرف آب ہے یا نہیں اے لال تمام بخت جگر رن میں ہو گئے پامال
نہیں بیان کے قابل جو کچھ ہے دل کا حال تم ایسے وقت میں رخصت کا کر رہے ہو سوال
مقام غور ہے انصاف سے گزرتے ہو
ذرا سمجھ کے کہو کیسی باتیں کرتے ہو

ہم ایک بات بتائیں اگر کرو منظور جو دل میں جنگ و جدل کا ہے شوق بہر حضور
تو ان سے لڑ کے نکل جاؤ ایک سمت کو دور ہمیں تو کام ہے امت کا جان دینگے ضرور
ہمارے قتل کی احباب کو خبر دینا
پدر کی لاش کو پھر آکے دفن کر دینا

بعد حصولِ رخصت جناب علی اکبر تقریب تسلیم تشریف لاتے ہیں اور جناب زینب بمحبت انگیز الفاظ میں غصہ و رنج کا اظہار فرماتی ہیں۔ زبان اور طرزِ گفتگو قابلِ دید ہے

محل سرا میں جو داخل ہوئے علی اکبر ۔ زمیں پہ صوبِ بیٹھی تھیں زینبِ مضطر
کیا سلام جھکے سینے سے لگایا سر ۔ کہا میں تم بھی طلبگارِ اذن ہو دلبر
بدن سے رخصتِ جاں کا پیام لائے ہو
پھوپی کے دل کی تڑپ دیکھنے کو آئے ہو

نثار ہو گئی بے جا ہے تم کو سمجھانا ۔ کہ ہو خدا کی عنایت سے عاقل و دانا
ابھی نہ ذکرِ جدائی زباں پہ لانا ۔ پھوپی کی قبر بنا لو تو مرنے کو جانا
ہوئی ہے بار جوانی جو مرنے جاتے ہو
ریاضتیں مری کیوں خاک میں ملاتے ہو

خدا کی شان ہے کہ خود دل سے آپ خود مختار ۔ چلے ہیں مرنے کو میداں میں باندھ کر تلوار
لحاظ اب نہ کروں گی کہ آرہا ہے پیار ۔ کہوں گی لفظ خلافِ مزاج اے دلدار
یقیں ہوا کہ محبت کا تم کو جوش نہیں
بُرا نہ مانیو واری کہ مجھ کو ہوش نہیں

جوان ہوتے ہی کیسے بدل گئے فی الفور ۔ کبھی تمہاری محبت کا مجھ سے تھا یہ طور
نگاہ اور ہے آج آنکھ اور تیور اور ۔ تم اور ہو گئے بیٹا۔ اگر کرو کچھ غور
یہ حال تھا کبھی دم بھر جدا نہ رہتے تھے
وہی ہو تم جو پھوپی جان مجھ کو کہتے تھے

میں کون ہوں مجھے پہچانتے ہو تم واری ۔ ابھی سے بھول گئے میری محنتیں ساری
ہوئے جوان ملی فوجِ شہ کی سرداری ۔ یہ سب ہوا تمہیں گویا سفر کی تیاری
شکن جبیں پہ ہے کیوں مرنے کی رضا کے لیے ۔ خفا ہو مجھ سے کہاں سے کہو خدا کے لیے

جناب زینب فرماتی ہیں

اگر یہ جانتی میں تم کو پالتی نہ کبھی ‏ ‏ اگر جہاں میں بھتیجے کو جانتے ہیں سبھی
اگر یہی تھا تم اُلفت مجھ سے کرتے کبھی ‏ ‏ کرو یہ وعدہ تو دیتی ہوں تم کو رخصت ابھی

کہ ساتھ ساتھ سوئے فوج شام جاؤں گی
تمہیں ہٹا کے میں شمشیر و تیر کھاؤں گی

مزاج میں ابھی بچپن ہے اے شبیہ رسول ‏ ‏ یہ ضد نہیں ہے کہ مرنے کے واسطے ہو ملول
مٹائے دیتے ہو کیوں رونقِ ریاضِ بتول ‏ ‏ بھلا بھی ہوئی بستی اُجاڑنے سے حصول

پھوپی کا نام ہے میرا نہ غم سوا ہوگا
بتاؤ ماں ابھی سُن پائے گی تو کیا ہوگا

یہ ضد ہے جانے والوں کے ساتھ گویا ہر ‏ ‏ ریاضِ خُلد میں جانے کو جانتے ہو سیر
بھلا میں غیر ہوں ماں باپ تو نہیں ہیں غیر ‏ ‏ یہ جان لو کہ ہے دونوں کا خاتمہ بالخیر

خیال کچھ تمھیں بابا کی بیکسی کا نہیں
مثل ہے سچ کہ جہاں میں کوئی کسی کا نہیں

کوئی جواب دو قربان ہو گئی بیٹا ‏ ‏ میں کہتے کہتے تو ہلکان ہو گئی بیٹا
جو بستی پہلے تھی ویران ہو گئی بیٹا ‏ ‏ وہ صحبت اگلی پریشان ہو گئی بیٹا

ستم زدوں کو نہ تدبیر ہے نہ چارا ہے
بس اب خدا کا سہارا ہے یا تمہارا ہے

یہ کہہ کے بولیں کہ بھائی ذرا ادھر آنا ‏ ‏ یہ کچھ سمجھتے نہیں ہیں ہمارا سمجھانا
ٹھہر گیا طرفِ لشکرِ ستم جانا ‏ ‏ ہوا ہے مجھ کو کہ میں منظور ہر جیسا پہلے تھا

جواب دیتے نہیں سر جھکائے بیٹھے ہیں * خبر بھی ہے علی اکبر وداع ہوتے ہیں

رخصت ہونا علی اکبر کا / تاسف

یہ سن کے بانوئے ناشاد بے قرار آئی — ہوا ملال کہ ہونٹوں پہ جان زار آئی
سیہ لباس پہن کر وہ سوگوار آئی — قریب زینب ناچار اشک بار آئی
پسر کو دیکھ کے خاموش بھی رہا نہ گیا
بس ایک آہ تو کی اور کچھ کہا نہ گیا

اُٹھے سلام کو یہ گر پڑیں وہ تھرا کر — انھیں سنبھل کے تو چلائیں اے علی اکبر
کہاں کا قصد ہے قربان ہو گئی مادر — جگر پہ تیر چلا دل پہ چل گیا خنجر
مرے دُکھے ہوئے دل کو عبث دکھاتے ہو
مجھے بھی لیتے چلو گر جہاں سے جاتے ہو

ذرا پھوپھی کی طرف بھی لال دھیان کرو — رضا کے واسطے منت نہ میری جان کرو
بس اب سوا نہ محبت کا امتحان کرو — جئیں گی بعد تمہارے نہ یہ گمان کرو
قریب مرگ ہیں کیا دیکھتے ہو حال ان کا
تمہیں قبول ہے صدقہ گئی ملال ان کا

پدر ہیں پیر جواں تم ہو گھر کا بار اُٹھاؤ — وہ راہ دیکھتی ہو گی بہن کو لینے جاؤ
سکینہ دیر سے روتی ہے پاس اپنے بلاؤ — بلائیں لینے دو اے لال مُنہ تو آگے لاؤ
غضب ہے ماں کو ضعیفی میں تم چھوڑتے ہو
تھکے ہیں پاؤں ہاے تو ہاتھ جوڑتے ہو

جناب علی اکبر کا جواب نصیحت حسین

جھکا کے سر کو یہ کہنے لگے علی اکبر — پھوپھی کا آپ کا ارشاد تو بجا ہے مگر
یہ کس طرح سے بھلا جاؤں میں [illegible] — کوئی نہیں ہے اکیلے کھڑے ہوئے ہیں [illegible]
غلام ساتھ نہ اس وقت دے دغا نہ کرے جو اُن کی جان پہ کچھ آ بنے خدا نہ کرے

حالتِ اہلِ حرم وقتِ وداعِ علی اکبرؑ

چلے محل سے جو ہمراہ سرورِ ذیشاں — گلے سے لپٹی پھوپھی ماں کمر سے لپٹی ماں
پکارتی تھیں کہ ہوتا ہے آج گھر ویراں — خدا کی حفظ میں تم کو دیا علی کی اماں
بہارِ باغِ علی و بتول لے کے چلے
یہ پالنے کا صلہ ہے کہ داغ دے کے چلے

امام حسینؑ جوان بیٹے کو مرنے کی اجازت دیتے ہیں اور بس جوشِ محبت سے ملاقاتِ آخری کی رسم ادا فرماتے ہیں

جھکے نہ جاؤ ادب سے میں گر پڑوں نہ کہیں — خدا گواہ ہے طاقت کا مجھ میں نام نہیں
لگا دو سینہ سے سینہ تو دل کو ہو تسکیں — ملا دو ہونٹھ مرے منہ سے لو جبیں سے جبیں
لحاظ ہو تو کنول کب دلوں کے کھلتے ہیں
بس اس طرح سے ملو جیسے دوست ملتے ہیں

یہ کہہ کے جانبِ مقتل چلے شہِ والا — بس آگے بڑھ کے یہ ہمشکلِ مصطفےٰ نے کہا
خدا بہر آپ مرے ساتھ آئیے بابا — کہا امام نے مجبور ہوں میں اے بیٹا
نہ اس طرح سے کبھی مضطر و حزیں جاتا
یہ مجھ کو دل لیے جاتا ہے میں نہیں جاتا

حضرت علی اکبرؑ کی جنگ

نہیں ہے تاب یہ اعدا کو ہے گلہ دل کا — خطر کی فوج نے لوٹا ہے قافلہ دل کا
لہو اگلنے سے نکلا یہ حوصلہ دل کا — جگر کا خاتمہ ہے اور فیصلہ دل کا
عجیب عالمِ حیرت میں سب جفا جو ہیں
کہ ایک تیغ سے چورنگ دونو پہلو ہیں

صفتِ تیغِ سر شکن

دکھا رہی ہے چمک تیغ کی نیا انداز — دکھائی دیتی ہیں دو عین چمکتی ہے جو بیاز
نکل چلا کوئی بیچ کر جو تفرقہ پرداز — لگا کے آپ نے اوچھا سا دو دی آواز
کہ زخمِ تیغِ دو دم یادگار لیتا جا ✱ نشانی ایک تو اسے بدشعار لیتا جا

ایک سیدھ پر جنگ کرتا تھا ہیں اور جناب علی اکبر کے ہاتھ سے مارا جاتا ہے

بڑھے تو ہو بچے لشکر کے ہم بہم توڑے
ہزار ہا سر کفار رکم سے کم توڑے
پھر برے پہاڑ کے پھینکے ادھر علم توڑے
دکھا دی بت شکنی مثل جد صنم توڑے

خدا کے بعد ہیں ہم سب کو یہ بتاتے ہیں
ہر ایک وار پہ تکبیر کہتے جاتے ہیں

یہ سن کے آئی حیا تیغ لی۔ بڑھا جلاد
گر نذان کو نہ پہنچی تو یوں کیا ارشاد
غضب کے ہاتھ لگانے لگا ستم ایجاد
تجھے تو کچھ ہنر جنگ خاک بھی نہیں یاد

عیاں ہے صاف کہ دونوں پہ خوف طاری ہے
فرس کو روک سنبھل۔ اب ہماری باری ہے

وفا سے دل ترا نامرد ہٹ نہ جائے کہیں
زرہ جلم نہ ہٹا چہرہ کٹ نہ جائے کہیں
نظر نہ پھیر ادھر دھیان بٹ نہ جائے کہیں
جھجک کے تیغ سے گھوڑا الٹ نہ جائے کہیں

فرس کا ہے یہ پس و پیش ایک یوں سمجھتا ہے
بڑھا کے آگے خوف سے کیوں دیکھے پیچھے ہٹتا ہے

بڑھے یہ کہہ کے لگے چلنے نیمچے ووا
لعیں کی انگلیاں کٹ کٹ کے گرتی تھیں پیہم
اٹھا یہ زور ہوا دست یا چہ ظلم شعار
ہوا یہ حال لگی گرنے ہاتھ سے تلوار

کہا انھوں نے جو زخمی ادھر کلائی ہوئی
یہی تھی ضرب ید اللہ کی بتائی ہوئی

* * *

ہوا دا شرطِ محبت تو جزا ملتی ہے

بند ۱۴۸ (در حالِ امام حسینؑ)

علمِ سبز حسینی کا ذکر کرتے ہوئے آئینہ بہار اور اندازِ بیان کا بل ملاحظہ ہو

آگیا خیمہ سے با ہر شہِ مرداں کا خلف
سب کو جوش آگیا جرار بڑھے تیغ بکف
لشکرِ شام میں بجنے لگے ہر سو دف
فوجِ اسلام میں تکبیر ہوئی ہر طرف
شیروں کے نعرۂ شیرانہ سے رَن تول چکا
پسرِ شیرِ خدا سبز علم کھول چکا

علمِ شاہ کی میدان میں ہے طرفہ بہار
بجلی گرتی ہے لعینوں پہ چمک کے ہر بار
آنکھیں ہیں بند گرے پڑتے ہیں ان میں خوار
صبح کے وقت کا ہونے لگا ہر جا اظہار
دم بدم یاں سے جو پنجہ کی ضیا جاتی ہے
دھوپ جنت کے درختوں پہ نظر آتی ہے

یہ علم فوجِ حسینی کے چمن کی ہے جان
باغِ اسلام کی رونق ہے یہ پنجہ کی ہے شان
پانچ پتی کا کھلا پھول یہ ہوتا ہے گماں
گلِ صد برگ کی مانند سنہری ہے نشان
غازہ رنگ اس کا بنا حور کے چہرے کے لیے
پھول کھلنے لگے ہر باغ میں سہرے کے لیے

پوچھا بہمن کو نہ ہمراہ ہوا دے لی
گرد کی پاک کہ تھی پانی کی چادر میلی
گل و بو کے لیے تشبیہ ہے محمل لیلی
پھول کھلنے کی خبر آئی کہ خوشبو پھیلی
علمِ شہ کے پھریرے کی یہ زیبائی ہے
عطر ملنے کے لیے فصلِ بہار آئی ہے

اس کا حال ہے بہارِ چمنستان دو صد
ہیں قوی ہاتھ کہ ہے تیغ ابھی پی کے شہد

پھل سے شمشیر کے ظاہر ہے کہ قبضہ میں نہر
لہر آئے سبز پھریرے کی کہ سبزہ کی لہر

شوق میں دور سے غلماں بھی اسے چومتے ہیں
جب ہوا آتی ہے جنت کے شجر جھومتے ہیں

دل سے فرمایا غم و رنج کے دفتر کھولیں
جن سے ہم چھٹ گئے جی کھول کے ان کو رو لیں
چھائی ہے گرد الم آنسوؤں سے منہ دھو لیں
موت نزدیک ہے اب بہنوں سے رخصت ہو لیں

حال اندوں کا ہے اندوہ سے کیا دیکھ آئیں
سب کو پھر ایک نظر چل کے ذرا دیکھ آئیں

وانعا امام شہید ہوچکے ہیں لشکر اعدا سے ماند ظلمی کی سزا آپ خیمہ میں بیبیوں سے رخصت ہوتے ہیں۔

آرزو تھی کہ سر تربت اصغر روتا
کبھی قاسم کے لیے گہ پئے اکبر روتا
بہر عباس علم دار یہ مضطر روتا
ملتی مہلت تو ہر ایک قبر بنا کر روتا

رہتا مشہور سدا خلق میں وہ غم کرتا
ہاتھ بیکار نہ ہوتے تو میں ماتم کرتا

کہہ کے یہ اور پریشاں ہوئے سلطان عرب
آ کے خیمہ میں صدا آپ نے دی اے زینب
کہو بیبیوں سے کہ ملنے کے لیے آئیں سب
کر لیں جا بہر بکا دل میں جو کچھ ہو مطلب

اب امامت انھیں ہونے کو ہے ہشیار کریں
قصد ہے اپنی سکینہ کو ذرا پیار کریں

دوڑیں سیدانیاں خیمہ میں ہوا حشر بپا
سب کی سب آئیں قریں برہنہ سر برہنہ پا
شور ماتم ہوا جب بیٹھنے لگے شہ زہرا
غم یہ تھا زینب مضطر کے نہ تھے ہوش بجا

پاؤں پر جھک گئیں الفت سے دعائیں دیکے
ام کلثوم نے آنکھیں بھائی کی بلائیں لے کے

شہ نے فرمایا کہ اس قوت جو اکبر جیتے تھے
اور ملتی عمر بھی ہم سے سر پیٹ کے تم جیتے تھے
اے بہن اس سے سوا شکوہ کسی منہ کو تکتے
یا گلا کاٹ کے خود جانِ حزیں کھوتے تھے

مل گئی خاک میں کیا چاند سی صورت اُن کی
حشر تک ہم کو نہ بھولے گی محبت اُن کی

زور ہاتھوں میں علی کا مگر اُف ری غربت
کس قدر ہو گئی اٹھارہ برس میں شہرت
وہی سیرت مرے نانا کی وہی صورت
جو قبا پہنی ہوئی بیاہ کا گویا خلعت

کیسی پیاری تھی رسولِ دوجہاں کی آواز
کان میں آ رہی ہے اُن کی اذاں کی آواز

نور آنکھوں کا اُجالا وہ مرے گھر کا تھا
اس سبب سے نہیں کہتا کہ وہ مرا بیٹا تھا
خانداں میں مرے جو تھا وہ سب یکتا تھا
گو حسین بیٹے تھے مگر یہ تو نہ جانے کیا تھا

اک پیمبر سے سوا اپنا پسر دیکھ لیا
سنتے تھے حضرت یوسف کو مگر دیکھ لیا

خیمہ سے برآمد ہونا حضرت کا

شاہِ دیں روتے ہوئے خیمہ سے آئے باہر
چور زخموں سے بدن سیکڑوں صدمے دل پر
کی نظر چار طرف پر کوئی آیا نہ نظر
ضعف میں گھوڑے کے نزدیک گئے گر گر کے

ایسے شاہنشہ دیں بے کس و بے یار ہوئے
تھامی زینب نے رکاب آ کے تو اسوار ہوئے

صفت اسپ خوش لجام

جم کے بیٹھے تو دلِ خستہ کو راحت پائی
پاؤں میداں میں جو بڑھایا تو قیامت آئی
شہ کو یاد آ گیا وہ قوتِ بازو بھائی
جوش میں آنے لگا اور غمِ تنہائی

آ گیا دھیان کہ تھوڑی سی ہی منزل کو ملا نگ پسر جوانی کا دکھا دوں سب کچھ

۱۳۶

اسپ پہچان گیا عزم شہنشاہ انام | کر لیا قصد کہ پامال کرے فوج شام
کام وہ کیجیے کہ خلق میں رہ جائے نام | یوں چلا رن میں چلتی ہے جس طرح سے حیدر کی حسام

شیر کی طرح قریب صف ہیجا پہنچا
ایک ہی جست میں تا فوج ستم جا پہنچا

تلوار کی تعریف

یہ چلی جن پہ وہ جینے کی قسم کھانے لگے | ابر وہ جس سے قضا ابر صفت چھانے لگے
آب ایسی ہے کہ ہر بحر میں موج آنے لگے | چمک ایسی ہے کہ دل برق کا تھرانے لگے

کب کسی دل میں دم جلوہ گری تھمتی ہے
کہیں شیشہ میں اُتر کے یہ پری تھمتی ہے

نور عین علی اس وقت جو ہیں مائل حرب | وہی غصہ ہے بعینہ وہی آنکھیں وہی ضرب
جسم چھیننے کے لیے پھر بھی ہے جازم عرب | زلزلہ یہ نہیں ہے گاو زمیں کو بھی ہے کرب

کروٹیں خوف سے رہ رہ کے بدلتی ہے زمیں
یا علی کہہ کے ہر ایک بار سنبھلتی ہے زمیں

رعشہ ہیں جتنے ہیں قلعہ خیبر کی طرف | اُن میں ہے شور کہیں لٹ رہے ہیں شاہ نجف
جس نے کاٹے ہیں پر جبریل اُلٹ دی ہے صف | جس سے جانیں ہوئی ہیں مرحب و عنتر کی تلف

خوف اس مرتبہ ہے جان چلی جاتی ہے
اسی تلوار کے چلنے کی صدا آتی ہے

فوجیں ہر ضرب پہ تھمتی ہیں کہ بٹتی ہے زمیں | گرد اٹھتی نہیں اس طرح سے اٹھتی ہے زمیں
پر بچھاتے نہیں جبریل کہ کٹتی ہے زمیں | غل فرشتوں میں ہے برپا کہ اُلٹتی ہے زمیں

اس قدر بحر کو بھی خوف کہ منہ پھیرے ہے * آسماں جھکنے کو چار طرف گھیرے ہے

ساقی نامہ

ساقیا اب تو میں اک جام لبالب لونگا
ایک قطرہ بھی ہوا کم تو بھلا کب لونگا
جس طرح پہلے دیا ہے مجھے پھر اب لونگا
جام کیا شے ہے خم و شیشہ سبو سب لونگا

ساقیا تجھ سا سخی خلق میں زنہار نہیں
جانتا ہوں کہ تجھے دینے میں انکار نہیں

دم بدم صورت دریائے کرم ہاتھ بڑھے
سیکڑوں جام چڑھا جائیں نہ تیوری چڑھے
نزع میں نشہ سے مملو ہوں آنکھوں کے ترشحے
ہم خدا ہیں نہ پیمبر ہیں کلمے نہ پڑھے

بعد اللہ و نبی ایک تجھے مانتے ہیں
دین اپنا تجھے ایمان تجھے جانتے ہیں

اس کے پینے سے نہیں رہتی شکایت کوئی
کہ پہنچتی نہیں عصیاں سے اذیت کوئی
نہ پیے یہ تو نہ مقبول ہو طاعت کوئی
اس سے بہتر نہیں دنیا میں عبادت کوئی

سجدہ ہر بار کروں مطلب دل پا جاؤں
دیے جا جام میں تسبیح پہ گنتا جاؤں

شہادت امام اور گریہ جناب زینب

ہو گئے ذبح شہ دیں گئی ہر سمت خبر
ہو گئے سب حرم پاک زیادہ مضطر
گھر سے مقتل کو چلیں شہ کی بہن برہنہ سر
بند آنکھیں کرو ایک شخص پکارا بڑھ کر

آبرو جانتے ہو غالب ہر غالب کی
بیٹی آتی ہے علی ابن ابی طالب کی

پہنچی نزدیک جو شبیر کے وہ شیدائی
روکے چلائیں کئی مرتبہ بھائی بھائی
ہائے جلتی رہی میں تم نے شہادت پائی
تم کو گھیرے ہوئے ہے بیکسی و تنہائی

نئے انداز سے یہ دشمن دیں لوٹتے ہیں + سر بھی تن پہ نہیں یوں بھی کہیں لٹتے ہیں

کربلا میں وہ ہنگامِ ماہِ محرم آئی
بند ۱۰۰ (در حالِ عون و محمد)

آمدِ بہار اور پژمردہ شاخوں کی کیفیتیں

نہ کسی نے خبرِ حالتِ نیک و بد لی ـ شہرہ آپس میں بہار آنے کی سب نے بدلی
باغِ عالم کی ہوا اور ہوئی رُت بدلی ـ نونہالاں پہ رہی ہیں چھائی ہوئی ہر بدلی

خشک گل تر ہوئے، پیروں کو جواں کرتا ہے
آبیاریِ چمن آرائے جہاں کرتا ہے

نام ساماں ہی اب بے سر و سامانی کا ـ ٹوٹے فوارے بھی اور زور بڑھا پانی کا
باغبانوں کو یہ موقع تھا نگہبانی کا ـ نام گلزار میں رکھتے نہ پریشانی کا

ہوں میں زینت کا سبب صاف یہی کہتی ہے
آج کل پتوں میں سنبل کے چھپی رہتی ہے

باغباں کو ہوئیں مشکلیں آسانی میں ـ پھول بہتے ہیں حبابوں کی جگہ پانی میں
ہے محبت گیسوئے سنبل کی نگہبانی میں ـ لاکھ جمعیتِ خاطر ہے پریشانی میں

کشتی آ کے کبھی تھم سکتی نہیں دھارے پر
گر کے گل شاخ سے تیرے ہیں فوارے پر

حسینؑ کو انصار کی یکے بعد دیگرے فائز بہ شہادت ہونے دیکھ کر جنابِ زینب کے فرزندوں کو بھی بیتابیِ نصرتِ حسینؑ پیدا ہوا اور آپس میں ہمکلام ہوئے

رنگ یہ دیکھ کے گھبرا گئے زینب کے پسر ـ مشورہ کرنے لگے وہ گلِ باغِ جعفر
چل کے اماں سے کہو شہ سے کہیں بلوا کر ـ ہم کو مل جائے رضا پہلے فدا ہوں شہ پر

آج ہر اک گلِ امید چُننے گا بھائی
دیکھنا کوئی ہماری نہ سنے گا بھائی

کہا چھوٹے نے بڑے بھائی سے ہاں اب چلیے ـ کہیے خود دیکھیے کیا کہتی ہیں اماں چلیے

عونؑ و محمدؑ کی گفتگو علم لینے کا اشتیاق و اظہار جناب زینبؑ کی غصہ آمیز تقریر

اذن وہ دیں جو حضورِ شہِ ذیشاں چلیے — پھر سوئے باغِ جناں خرم و فرحاں چلیے
پہلے بے فکریِ جاہ و حشم بھی کیجے
گر مناسب ہو تو کچھ ذکرِ علم بھی کیجے

دونوں یہ کہہ کے جو گھر میں گئے بولی ہاں آؤ — کہو کیا کام ہے کیوں آئے ہو تم جلد بتاؤ
عرض کی دونوں نے دل کہتا ہے ہرگز نہ چھپاؤ — ہم علم لینے کو آئے ہیں کہا باہر جاؤ
مثل جعفر ہوئے یا جعفرِ طیار ہوئے
واہ وا خوب علم لینے پہ تیار ہوئے

لاکھ صدموں میں گرفتار ہوں میں زار و حزیں — ہے اگر فکرِ علم تم کو تو لو جا کے کہیں
اب مرے دل میں محبت کا کہیں نام نہیں — کوسے تم دونوں کو کوئی تو کہوں آئیں یہاں
جائیں جائیں تو علم لینے کا قصہ جائے
بات رہ جائے جو اس وقت اجل آ جائے

مجھ کو دینے کے لیے صدمہ و غم کیوں آئے — چھوڑ کے خدمتِ سلطانِ امم کیوں آئے
دل میں پچھتاتے تو اب ہوگے کہ ہم کیوں آئے — رنج ہوتا ہے مجھے ذکرِ علم کیوں آئے
اب ہے ضد مجھ کو کہ تم دونوں کی ضد کھوؤں گی
بھائی دیں گے بھی اگر اب تو نہ دینے دوں گی

جناب زینبؑ صاحبزادوں سے علم کی استحقاق علمداری کی وجوہ بیان فرماتی ہیں

لو سنو مجھ سے وراثت کا اگر ہے دعوےٰ — تم کو کیا بیٹھے ہیں جعفر کہ تمہارے بابا
منتقل کر گئے خود شاہِ رسل یہ عہدہ — دلبرِ حیدرِ کرار ہیں سلطانِ ہدا
وہ بھی وارث ہیں طلب بھی نہ اگر پاؤں گی
گر خدا چاہے گا عباس کو دلواؤں گی

ہی غضب میرا خجالت سے نہیں اٹھتا سر
سامنے سب کے کہا تم نے جو تھا مدِ نظر
کیا تعجب ہو جو غصہ شہ کو آجائے اگر
ہو گئی ہوگی اُنھیں علم امامت سے خبر

مجھ کو شرم آتی ہی کیا سامنے جاؤں شہ کے
بات میری گئی تم چھوٹ گئے بچہ کہہ کے

لاکھ سمجھایا تمھیں کچھ نہ ہوا آہ صد آہ
باتیں یہ خوب نہیں دل میں سمجھتے ہو نہیں
ہیں مشیت سے خدا کی شہ والا آگاہ
مُنہ سے اب نام علم کا نہ نکالو للہ

جتنے ہیں فخر شجاعان عرب مانگیں گے
رشتہ جن جن کو نبی سے ہی وہ سب مانگیں گے

عذر کیا اُن سے کیا جائے گا کچھ بتلاؤ
ایسے بچہ نہیں۔ لازم ہی مجھے سمجھاؤ
ہی علم ملنے سے بہتر کہ شہادت پاؤ
سرخ رو خوں میں ڈوبے ہوئے گھر میں آؤ

پاس ایک ایک کا کس طرح کیا جائے گا
عہدہ یہ ایک ہی کس کس کو دیا جائے گا

گوشۂ چشم سے کرتی تھیں جو غصہ کی نظر
ہاتھ جوڑے ہوئے وہ کانپ رہے تھے تھر تھر
یہ خبر سن کے چلی آئی سکینہ مضطر
آبدیدہ انھیں دیکھا تو کہا گھبرا کر

شاہ کو اُن سے ہی عشق اور وہ عاشق شہ کے
ہم دلا دیں گے تمہیں اپنے چچا سے کہہ کے

مسکرا کر کہا زینب نے کہ ناجی۔ جی نا
وہ بُرا مانیں گے ہرگز نہ چچا سے کہنا
آبدیدہ ہیں تو کیا رو دینگے تو کیا ہوگا
تم تو ناداں ہو سمجھتی نہیں مطلب ان کا

ظاہر اگر علم شبیرِ خدا مانگتے ہیں ✻ اسی پردہ میں یہ مرنے کی رضا مانگتے ہیں

جناب زینب کے غصے کی وجہ سے دونو صاحبزادہ سہمے ہوئے کھڑے ہیں مگر جناب سکینہ آتی ہیں اور عہدہ علمداری کے لیے جناب عباس کی سفارش کا وعدہ فرماتی ہیں مگر جناب زینب انکار فرماتی ہیں

چھوٹے صاحبزادے (محمد) کی تقریر اور تقسیم علم و تیغ

کی یہ چھوٹے نے جسارت کہ کہا اے اماں
سچ ہیں بے شبہ کہو آپ نے جو امر بیاں
ہیں نبی زادے وراثت تو ہماری ہے عیاں
نانا و دادا کے دکھانے ہیں ہمیں آج نشاں
یہ بڑے ہیں انھیں لشکر کا علم دیجیے
ہم لڑیں فوج سے اک تیغ دو دم دیجیے

اسی سلسلہ میں جنابِ زینب کی مزید تقریر

اک تعجب ہوا کی آپ نے حیرت سے نظر
ہاتھ مارا کبھی سینہ پہ کبھی زانو پر
دفعتاً حال ہوا ہو کوئی جیسے ششدر
بولیں میں سمجھی تھی لینا ہے علم رو رو کر
اب کھلا مرتبہ میں سب پہ یہی غالب ہیں
ذوالفقارِ اسد اللہ کے یہی طالب ہیں

رنج ظاہر ہو وہ چشم اور وہ ابرو کیوں ہیں
کیوں پریشان ہو بکھرے ہوئے گیسو کیوں ہیں
ہے خوشی مرنے کی تو آنکھوں میں آنسو کیوں ہیں
غم ہے کیا باتوں میں یہ درد کے پہلو کیوں ہیں
قاسم و اکبر و عباس کو سمجھا دو بی بی
پہلے ان سب کے رضا مرنے کی دلوا دو بی بی

امام حسینؑ خیمہ میں تشریف لاتے ہیں جنابِ زینب علم سجا کے دیتی ہیں اور عباس علمدار باہر لے کے آتے ہیں

گفتگو کچھ ابھی باقی تھی کہ آئے شہِ دیں
اور اشارہ سے کہا جا یہ ٹھہرنے کی نہیں
پھر کے فرزندوں کی جانب علم سجنے لگیں
دے کے بھائی کو نشاں بولے شہِ عرش نشیں
کمریں جرّاروں کی اے ماہ لقا بند ہوئیں
واں صفیں بند ہو گئی ہیں تم بھی پرا بند ہوئیں

کر کے تسلیم چلا وہ دل و جانِ حیدر
در پہ حاضر ہوئے انصار پہنچی جو خبر
تھی وہی شانِ علی وہ وہی تھے تیور
لے چلے آپ علم کر کے سلامی باہر
فوج اسلام کی تسلیم کو آمادہ تھی ✱ فضہ پردہ کو اٹھائے ہوئے استادہ تھی

اپنے بابا کی طرح یہ بھی ہیں خالق کے ولی — ہوگا اک حشر بپا ان سے جو تلوار چلی
رتبہ ان دونوں کا ہے سارے زمانہ پہ جلی — علمِ احمدِ مختار کے حامل ہیں علی

عزتِ شان سپہر بریں سے بڑھ جاتے ہیں
حضرتِ خضر عمامے کے لیے جاتے ہیں

بڑھ گئے دل علم اس شان سے باہر آیا — سرِ شبیر پہ عباس کیے تھے سایا
فوجِ اللہ و پیمبر کو مسلح پایا — واں سے سبقت ہوئی حکم آپ نے بھی فرمایا

سینے تانے ہوئے سب صاحبِ شمشیر بڑھے
وجہ غصہ کی ہوئی زخم لگے شیر بڑھے

جا کے ایک ایک نے میداں میں کی جنگ وفا — خود گئے خلد میں اور نار میں فوجِ اعدا
لڑکے مسلم کے بھتیجوں نے بھی کی رن میں قضا — جلد گھر میں گئے جانِ دلِ زینبِ زہرا

کہہ کے سب حال کہا شہ سے گزارش کیجے
وقت ہے وعدہ وفائی کا سفارش کیجے

بعد شہادت انصار عون و محمد حضرت زینبؑ سے رخصت چاہتے ہیں اور وہ بخوشی نصرت حسین کے لیے اجازت دیتی ہیں بچوں کے دل بڑھاتی ہیں اور مرتبہ شہادت یوں فرماتی ہیں۔

کہا زینب نے کہ ہاں مجھ سے ابھی لو رخصت — جلد سامان کرو چاہیے بیشک عجلت
کرو مظلوم حسینؑ ابنِ علی کی نصرت — آج تم ندوہ سے تلوار کے لے لو جنت

مختصر کہتی ہوں جاتی رہے یا جان رہے
وضع کا اپنے بزرگوں کی ذرا دھیان رہے

سنتی ہوں ان میں کئی لاکھ ہیں فوجِ ناری — تم بھی دونوں مدد شہ کی کرو تیاری
بس اسی دن کے لیے تھی مری محنت ساری — آج کے مرنے کو مرنا نہ سمجھنا واری

دیکھو قرآں میں شہیدوں کا بڑا رتبہ ہے ✦ پاس اللہ کے ہیں رزق انھیں ملتا ہے

کہہ کے یہ زینبِ مضطر ہوئیں حال افسردہ تن — آنکھیں پُر آب تھیں چہرے سے ٹپکتی تھی یاس
تھا عیاں دل کے دھڑکنے سے غضب کا ہراس — دیتی جاتی تھیں بھتیجوں کے بیاں کو دلاس

دھیان آیا کہ امید ہے اب کھیلنے کو
کمر پہ بند ہوئے کھڑی ہو گئیں خود ملنے کو

صفتِ رہوار

دوڑے یوں ساتھ ہوا گا گرمی گاہ تھی — خاک کب اُڑتی تھی تعظیم کو تھمتی تھی جمی
یہ سبک چلنے لگے گرد سموں پر نہ جمی — دیکھنے والوں کی سانس آنے میں کمی تھی

راہ میں طائرِ وہم ان کو نہیں پا سکتا
تیز رو ہیں کہ پسینہ بھی نہیں آ سکتا

سر قلم کرنے میں بچوں کو بہت ہی تعجیل — ہوتی جاتی ہے جب پے رہت فنا فوجِ ذلیل
شاہزادوں کا ہے حکم اُس کی ہے واجب تعمیل — دونوں ہاتھوں سے ذرا کام کریں عزرائیل

ہیں اگر ہوش پراگندہ درستی نہ کریں
تیز دستی کا یہ ہنگام ہے سستی نہ کریں

فرزندوں کے دلیرانہ حملوں پر جناب زینب کا اظہارِ خوشی

آئیں تھیں بیٹوں کو پہنچانے جو زینب نکلیں — شورِ اعدا جو سنا اپنی جگہ سے اُٹھیں
بولیں غصے سے کہ لو بھاگتے پھرتے ہیں لعیں — کہہ کے یہ بنتِ علی آ گئیں پردے کے قریں

آرزو تھی کہ یہاں لاشہ پہ لاشہ دیکھوں
میں تو دونوں کی لڑائی کا تماشہ دیکھوں

بولیں جب دم وہ بھرے کے نشاں جاں بیر — دیکھو دم بھر میں کیے دیتے ہیں لاشوں کے ڈھیر
اب تو پیچھے پڑے ہیں جھاڑ کے پنجے مرے شیر — سب بزرگوں کے تصدق ہیں ہوا اور دلیر

ہو گئے ہاتھ قوی نام جو دو تیں سے لیے ✱ دونوں بچوں نے جوانوں کے علم چھین لیے

جب چھٹتے ہیں تو اچھے ہیں یہ تو فرقتی ہیں ہاں ۔۔۔ واہ واہ اے مرے بچو انہیں خالق کی اماں
بچیو جان نہ ڈر کر مرد و شاد و نہ ہاں ۔۔۔ دودھ میں بخش چکی تم کو مبارک ہو جہاں
میں دعا مانگتی ہوں فضل خدا کا ہو جائے
جس لیے تم گئے ہو کام وہ پورا ہو جائے

فوج اعدا کا ان بچوں کی دہشت۔ ابن سعد کا خطاب اور پہلوانوں کا جواب۔

پہلوانوں سے ابن سعد لعیں نے یہ کہا ۔۔۔ فوج تو بھاگ گئی پر خبر ہو اے تمہیں کیا
دو جوان چھوٹے سے بچوں سے نہیں کر سکتے وغا ۔۔۔ گود میں ان کو اٹھا لاؤ جو رکھتے ہو حیا
وقت آ جائے تو رستم سے بھی لڑ لیتے ہیں
لوگ تو گھیر کے شیروں کو پکڑ لیتے ہیں

بولے ہاں لڑتے ہیں جب تاب نہیں سر دلیر ۔۔۔ پہلے جو بھاگ گئے بیٹھے جاتے ہیں ان کو پھیر
تو نکل فوج سے ہم ساتھ ہیں چل کر انہیں گھیر ۔۔۔ ہم ہیں دو ماہ سے کم وہ اسد اللہ کے شیر
کفر و اسلام میں اوّل سے کبھی میل نہیں
جنگ ان بچوں سے دشوار ہے کچھ کھیل نہیں

یا حسین ابن علی آپ کا ذاکر ہوں میں

بند ۱۰۹ (درحال امام حسینؑ)

امام حسینؑ کی مع انصار میدان میں تشریف آوری

نکلے خیمہ سے مسلح جو شہنشاہِ عرب — بعد تسلیم پھرے گرد تمام اہل عرب
اُٹھے سجاد دس تیغیں لیے انصاری سب — شاہ کے ساتھ بڑھے سیر کو وہ پیش و عقب
سب ہنسے آئی نظر ایسی فضا مقتل میں
گلشنِ فاطمہ کے پھول کھلے جنگل میں

صبح کے دلفریب مناظر۔ اور کیفیت چمن۔ یہ چند بند اُن تمام شاعرانہ خوبیوں سے مملو ہیں جن سے مغربی خیال کے حضرات کو وجد آتے ہیں۔ یہاں معلوم ہوتا ہے کہ رشید کی طبیعت کو قدرتی مناظر سے کس قدر حیرت انگیز لگاؤ تھا۔

وہ سماں صبح کا اور جانوروں کا وہ غل — پھول جو کھل رہے ہیں نغمہ سرا ہے بلبل
جب ہوا آئی جھکنے لگا زلفیں سنبل — ٹھنڈی ٹھنڈی وہ نسیم اوس میں ڈوبے ہوئے گل
وہ ہوا دشت میں آئی کہ چمن پھول گئے
پیاس دو روز کی سب تشنہ دہن بھول گئے

اے خوشا وقت کہ عالم میں ہے سامانِ بہار — سب مہیا ہیں چیزیں جو ہیں شایانِ بہار
پھر سنواری گئی ہے زلفِ پریشانِ بہار — صحنِ گلشن میں ہیں گل دست و گریبانِ بہار
پھول سب کھلنے لگے شاخ ہر اک پھلنے لگی
گر کے جب اوس تھمی سرد ہوا چلنے لگی

مد و ابر سے رکھتا ہے روانی پانی — کچھ جو کہتا ہے تو موجوں کی زبانی پانی
جا بجا عکس سے سبزے کے ہے دھانی پانی — جس طرف دیکھو نظر آتا ہے پانی پانی

آتش افروز کوئی چیز نہ تھی پانی میں
رنگِ گل کا جو کٹا آگ لگی پانی میں

ایسی مستانہ روش بادِ بہاری آئی
آنکھ نرگس کی کھلی باغ میں آہٹ پائی
اُلجھے پھولوں میں قلعۂ سبزہ بھی کرنے لگا
شاخیں جھومیں کہ ہر اک نخل نے لی انگڑائی

بلبل اس درجہ ہوئی شاد کہ چلّانے لگی
سبزہ لہرانے لگا نہر میں موج آنے لگی

کتنی دلچسپ ہے سبزہ کے نکلنے کی بہار
ہے زمیں باغ کی گویا کسی نوخط کا عذار
کیوں صبا دوڑتی پھرتی ہے میانِ گلزار
سبزۂ خوابیدہ ہے کہدے کوئی نرگس ہشیار

بے خبر ہے یہ عیاں ہے نظرِ بلبل سے
آنکھیں سب سینکتی ہے آتشِ رنگِ گل سے

کچھ عجب صبح رتیں غنچوں کی ہیں بھولی بھولی
منع بلبل نے کیا چیز کسی نے جو لی
جو فقیر آگیا بھر لی زرِ گل سے جھولی
بولی نرگس تجھے کیا بحث ہے تو کیوں بولی

بات جاتی رہے یہ حسنِ بیاں کھل جائے
کہیں ایسا نہ ہو سوسن کی زباں کھل جائے

وہ ہوا باغ کی وہ ابر کا آنا جانا
حسن اور عشق کا ہر ایک جو ہے دیوانا
قصہ بلبل کا کہیں گل کا کہیں افسانا
کثرتِ گل یہ ہے مشکل ہے خزاں کا آنا

رستے بند ہیں پھولوں کا مزا تازہ ہے
دہنِ غنچہ ہے یا باغ کا دروازہ ہے

امام حسینؑ عالم یاس میں کھڑے ہیں کوئی مونس و یاور نہیں کہ قاصد صغرا نمودار ہوتا ہے آپ اُس سے اپنی دور اُفتادہ بیٹی کا حال دریافت فرماتے ہیں قاصد امام حسینؑ کو دیکھ کے حیرت انگیز لہجہ میں اظہار تاسف کرتا ہے اور پھر حال صغرا کہتا ہے

چوم کر پائے مبارک وہ ہوا یوں گویا — میں نہ پہچان سکا آپ کو یا شاہِ ہدا
تھوڑے دن گذرے مدینہ میں ابھی دیکھا تھا — ریشِ اقدس ابھی سفیدی ہے جو پایا اے آقا

بہت اُترا ہوا ہے چہرۂ انور حضرت
سینکڑوں زخم ہیں اور خون میں ہیں تر حضرت

دل تڑپنے لگا فرمایا کوئی خط ہے لا — با ادب اُس نے قریب آکے جو مکتوب دیا
بولے شبیر کہ مشکل سے پڑھا جائے گا — اشک آنکھوں میں ہیں اور ضعفِ بصارت ہے سوا

ہے یہ نامہ غم و حسرت کی نشانی بھائی
حال کچھ اُس کا بیاں کر دے زبانی بھائی

سر جھکا کر کہا اُس نے کہ ہیں بیمار بہت — اب نقاہت سے ہوا ہو گئی ہیں لاغر بہت
ہوئیں گھر بھر سے جدا بڑھ گیا آزار بہت — سب کی مشتاق ہیں ہے حسرتِ دیدار بہت

منتظر آنے کی ہیں در پہ کھڑی رہتی ہیں
تب جو بڑھتی ہے تو بے ہوش پڑی رہتی ہیں

مکتوب صغرا لے کے حضرت خیمہ میں تشریف لائے سب بیبیوں کو حال سنایا اور پھر آمادۂ رزمگاہ ہوئے کہ جنابِ زینب نے روک لیا تاکہ وہ ایک تعزیت جنابِ فاطمہ کی پیش کریں

بولیں صدقہ گئی گھوڑے سے اُترآؤ ذرا — مجھ کو یاد آ گئی اک بات بہت خوب ہوا
اُترے گھبرا کے فرس پر سے شہنشاہِ ہدا — بیٹھ جاؤ جو کہا خاک پہ بیٹھے مولا

عرض کی ایک بات کس کا کہا کرتی ہوں
بھائی - اماں کی وصیت میں ادا کرتی ہوں

نزع کے وقت یہ فرما گئی تھیں مجھ سے خوش خو
بے خطا رن میں بہے گا ترے بھائی کا لہو
آئے جب رخصت آخر کو وہ میرا مہ رو
ذبح کا وقت ہے نزدیک سمجھ لینا تو
جب چلے مرنے وہ محبوس بلا اے زینب
چوم لینا مرے بچہ کا گلا - اے زینب

صفت شمشیر حسین

آب ہے سیل فنا دم ہے اک آفت اس کا
جا مے امید قضا ہے در دولت اس کا
کم سمندر سے نہیں جوش طبیعت اس کا
کھنچنا اک قہر ہے جھکنا ہے اک آفت اس کا
خوف سے اس کے فلک خم ہوا خم ایسا ہے
ملک الموت کی ہمدم ہوئی دم ایسا ہے

چال وہ قہر کی ہے جس سے زمیں ہل جائے
مردے اٹھنے لگیں ہر گور کی منزل ہل جائے
رعب ایسا ہے کہ طاقت نہیں سب ہل جائے
وہ چمک آنکھیں جھپک جائیں ہر اک دل ہل جائے
تیزی ایسی ہے کہ جو برق کو بھی مات کرے
غصہ ایسا کہ زباں کاٹ لے جو بات کرے

صاف کہتی ہے نہ کیونکر ہمہ تن ناز ہوں میں
طائر جان عدو کو پر پرواز ہوں میں
ایک قرآن ہے اور دوسرا اعجاز ہوں میں
وہ خدا کا ہے کلام اور خدا ساز ہوں میں
ذکر دین الحسن میں ہے میں دین کی شیدائی ہوں
اسمیں احکام ہیں اور حکم سے میں آئی ہوں

ساقی سے خطاب

ساقیا پہلے جو دی تھی وہی شیرا بہا دے
ہو مئے عشق بہت دے مجھے یا تھوڑی سی دے
حشر تک نشہ ہے جس کا شراب ایسی دے
ہاں تجھے اپنی محبت کی قسم جلدی دے

سہل پینا نہیں اس کا متردد دل ہے
نام لے کر ترا پی جاؤں گا کیا مشکل ہے

طلب امداد

بادہ نوشانِ محبت کو بڑا نام ملا
بعد اُن سب کے مجھے مے کا یہ کام ملا
بانیٔ جنت کہ سند خلعت و انعام ملا
جب میں آیا تو فقط دُردِ تہِ جام ملا

تو جو بے ہوش بنا دے تو مجھے ہوش آ جائے
تو جو دے بادۂ سرجوش مجھے جوش آ جائے

تو ہی ساقی مرا ہے ساقیِ کوثر ترا نام
غم کے غم آج پلا دے مجھے دے جام بہ جام
کام پینا ہے مرا اور پلانا ترا کام
رُوح کو چین ہو دل کو مرے آ جائے آرام

تا قیامت رہے عالم میں ترا دَور پلا
جس قدر نشہ زیادہ ہو کہوں اور پلا

پارسا بنتِ عنب کو بھی کہیں دیکھتے ہیں
سیرِ گلزارِ فلک گوشہ نشیں دیکھتے ہیں
حکم تیرا جو نہیں پھر کے نہیں دیکھتے ہیں
پیتے ہیں جو مئے دُنیا وہ زمیں دیکھتے ہیں

نشۂ بادۂ کوثر کو سوا کر ساقی
دے مئے غمِ غدیر اُس میں ملا کر ساقی

بزم میں دیکھ کے اندازِ کرم بیٹھ گئے
شوق میں جھوم کے ساقی کے قدم بیٹھ گئے
ذوق پینے کا جنھیں تھا وہ بہم بیٹھ گئے
ایک گوشہ کی طرف کہہ کے یہ ہم بیٹھ گئے

جام چلنے کو ہے سب اہلِ نظر بیٹھے ہیں ❁ آنکھ ساقی نہ چرانا ہم ادھر بیٹھے ہیں

ایک پہلوان حریف کو آتا ہے اور شکست کھا کر فنا ہوجاتا ہے

بیچے شہ کے قریب آگیا وہ پاکے کمک | آگے اک تیر کے پلے سے تھا وہ مردک
لی کماں شانہ سے ترکش سے نکالا ناوک | متصل آگئے شبیر جھپکنے ہی پلک
زور کا حربہ تھا نیزہ کی سناں بھی کاٹی
چلہ بھی تیر بھی۔ ظالم کی کماں بھی کاٹی

کہا للکار کے لے میاں سے جلدی تلوار | کھینچ کر تیغ دو دم کرنے لگا پیچ و وار
ٹوٹی تلوار جو اُس کی تو ہوئی اک جھنکار | دست باچہ ہوا جاتے جو بے ہوش اک بار
تھا تن و توش بہت اُس کا تو دم بھول گیا
دوسری تیغ تھی ہمراہ۔ مگر بھول گیا

میرا کلام کیوں نہ صداقت نشاں ہو
بند ۱۰۶ (در حالِ امامؑ)

تفاخرِ شاعرانہ میدانِ کلام آرائی اور عجیب تشبیہات

فضلِ خدا سے معرکے مارے بڑے بڑے — مضموں کے لوں نے نقش کیے جیسے نگ جڑے
میری طرح کسی کی طبیعت بھلا لڑے — منقول جانتا جو کوئی حرف گر پڑے
میدانِ نظم میں دمِ جنگ و جدال ہے
مضمون غیر نقل نہ ہو یہ خیال ہے

بڑھتا ہوں پڑھ کے نادِ علی بہرِ کارزار — مضموں کے دل سے نیزۂ فکرِ رسا ہے پار
صورت دوات سے ہوئی ترکش کی آشکار — پیکاں سے قطرہ ہائے سیاہی ہیں آبدار
ہر مد بنا ہے صورتِ میت کہ دم نہیں
جو دائرہ ہے خون کی تھالی سے کم نہیں

آفت کا رن پڑا ہے جدھر کیجیے نظر — نقطے نہیں کٹے ہوئے سر ہیں اِدھر اُدھر
زیر و زبر پڑے کبھی یوں تھے نہ پیشتر — مصرعے دو لخت ہوگئے۔ اک لطف ہے مگر
سارے حروف صف کی طرح ہیں ملے ہوئے
بین السطور زخم ہیں گویا کھلے ہوئے

غیظِ امامؑ اور حالتِ خوفِ اعدا

اس وقت غیظ میں ہے جگر بند بوتراب — چہرہ سے بار بار سرک جاتی ہے نقاب
ہے سامنے کبھی کبھی بدلی میں آفتاب — کچھ کچھ دکھائی دینے لگے ابروے جناب
رن میں کھڑے ہیں حیدرِ صفدر کی شان سے
غل ہے کہ ذوالفقار نکلتی ہے میان سے

غصہ میں ہیں حضور جو اُلٹے ہوئے نقاب — طورِ غضب دکھاتا ہے ذوالفقار کا [illegible]

وقتِ جلال ہی تو جہاں کو ہی اضطراب
اُبھرا کے چڑھ گیا ہی بلندی پہ آفتاب
حالت ہوئی ہی غیر ہر اک روسیاہ کی
سب کو جلائے دیتی ہی گرمی نگاہ کی

تپنے لگی وفورِ تب و تاب سے زمیں
پانی کی ہو گئی ہی سمندر میں بھی کمی
دریا سراب ہو گئے باقی نہیں نمی
اُف رے مزاجِ سرورِ والا کی برہمی
آثارِ غضب کا سب کو یہ عالم دکھا دیا
صحرا کے ہر گڑھے کو جہنم بنا دیا

ہی طرفہ شانِ جانِ رسالت پناہ کی
حالت ہی غیر ڈر سے عدو کی سپاہ کی
ہوگی نہ یہ شکوہ کسی بادشاہ کی
ہی رشکِ قہر سب کو زمیں از نگاہ کی
شہ کی نشست کج ہی فرس پر عتاب میں
گردن پہ ایک پاؤں ہی اک ہی رکاب میں

امام حسینؑ زخمی ہو چکے ہیں کوئی انصار و اعزا سے باقی نہیں کہ زعفر جن نمودار ہوتا ہی۔ اور اجازت نصرت چاہتا ہی۔

اُس نے کہا کہ اے اسدِ کبریا کے لال
مجھ سے ہو کوئی برسرِ پیکار کیا مجال
صدقہ میں آپ کے ہی یہ سب جاہ و جلال
ہیں لوگ ساتھ جو کریں لاکھوں کو پائمال
مر جاؤں لڑکے دھیان یہ ہر بار ہی مجھے
حضرت کا حال دیکھنا دشوار ہی مجھے

جناب امام کا استقلال آمیز جواب و تسلیم برضائے الٰہی

قربان اُس کے لطف و کرم کے میں ناتواں
کچھ تجھ سے اپنی پیاس کا عالم کروں بیاں
اُس کی عطا ہوئی تو دیا میں نے امتحاں
دل جل گیا ہی ایک نفس ہی شرر فشاں

گو سلسبیل کوثر و تسنیم پاس ہی
خالق بجھائے گر تو مجھے ایسی پیاس ہی

اپنی تو پیاس کا مجھے اتنا نہیں خیال — پیاسے جہاں سے جو گئے ان کا ہی بس ملال
آئے تھے پانی لینے کو عباس خوشخصال — مانع ہوئے غضب کیا ظاہر تھا ان پہ حال

رایت کی چوب خشک نہ تھی مدِ آہ تھی
سوکھی وہ مشک تشنہ لبی کی گواہ تھی

باتیں یہ کر رہے تھے شہنشاہِ نامدار — باجے بجا بجا کے بڑھی فوج نابکار
فرمایا میرے حکم سے جا اے وفا شعار — وہ وقت آ گیا مجھے تھا جس کا انتظار

ساماں کیا شروع سپہرِ ذی شعور نے
دو نو قدم رکابوں میں رکھے حضور نے

توصیفِ اسپ لاجواب

آتش نفس بھی ہے یہ فرس باد پا بھی ہے — قدرت خدا کی آگ بھی ہے اور ہوا بھی ہے
صرصر بھی ہے نسیم بھی ہے اور صبا بھی ہے — سرعت کی ابتدا بھی ہے اور انتہا بھی ہے

خلقت ہے اس کی کیا متحیر جہان ہے
اضداد جمع ہو گئے خالق کی شان ہے

مانندِ فکرِ شاعرِ خوش فکر دور رو — نازک خرام گو وہ وقار اور تیز رو
اس کو سبک روی کے طریقے ہیں یاد وہ — یوں رکھے پاؤں شمع کی ہلنے نہ پائے لو

مثلِ نگہ پھرے یہ کسی پر اثر نہو
محفل میں آ کے جائے کسی کو خبر نہو

صفت تیغ [illegible]

ہیں کچھ عجیب تیغ کے حالات وقتِ جنگ — ممکن ہوئے ہیں سارے محالات وقتِ جنگ

آتے ہیں اس کو طرفہ خیالات وقتِ جنگ
ہر اک زبان لاکھ سوالات وقتِ جنگ

فقرہ ہر ایک تیغ دو دم کارزار ہے
جوہر پکارتے ہیں کہ یہ ذوالفقار ہے

زندہ اسی کے دم سے ہے دینِ نبی پاک
نام اس کا سن کے ہوتے ہیں اہلِ ستم ہلاک
اڑتی ہے اس کے خوف سے لئے زمیں پہ خاک
کہتی ہے بار بار قضا روحنا فداک

کیوں ڈر سے آفتاب کا چہرہ نہ زرد ہو
دیکھے جو اس کی آنچ جہنم بھی سرد ہو

ہر ایک ساجِ ظلم و ستم کا نشاں گرا
اللہ رے زورِ تیغ ہر اک پہلواں گرا
کوئی سنبھل کے یاں سے جو اٹھا وہاں گرا
غل تھا زمیں بیٹھ گئی آسماں گرا

چلتی ہے یوں کہ فوجِ ستم پائمال ہے
قائل ہیں اس کے سب کہ قیامت کی چال ہے

اب ظالموں میں شورِ اماں صبدم نہیں
تھم جائیں ان میں ایک کے ایسے قدم نہیں
ہستی وہ کس کی ہے کہ قریبِ عدم نہیں
دم اس کا بھر رہا ہے لعینوں میں دم نہیں

دریائے فوجِ شام کی کیا کائنات ہے
اس بحر کا تو گھاٹ قریبِ فرات ہے

جس سے ملی یہ اس کے گلے سے قضا ملی
کٹ کٹ گئی جو راہ میں کچھ بھی ہوا ملی
بسمل تھے اس قدر نہ تڑپنے کی جا ملی
جب اُٹھی گر کے چرخ تہِ پا ہم جا ملی

دہشت سے آفتاب کا بھی زرد رنگ ہے
جلسے کو یہ خبر کہ قیامت کی جنگ ہے

ہے محوِ جنگ مالکِ تسنیم و سلسبیل — بہرِ سیاہ تیغ کا پانی ہوا سبیل
غصہ میں وار کرتے ہیں جب سرورِ جلیل — اپنے پروں کو دیکھنے لگتے ہیں جبرئیل
گہ ڈر سے دور گاہ محبت سے پاس ہیں
خیبر کا حال یاد ہے جو بے حواس ہیں

کھنچنا بھی اس کا قہر ہے جھکنا بھی ہے ستم — چلاتی ہے اجل کہ غنیمت ہے اس کا دم
جس دن سے آئی چرخ سے تیغِ شہِ امم — یکساں ہے آج تک کبھی تیزی ہوئی نہ کم
یہ وضع دار مثلِ شہِ خوش صفات ہے
کہنے کو دو زبانیں ہیں پر ایک بات ہے

سپریں کٹیں۔ جدا سرِ اہلِ ستم ہوئے — تیروں سے پر علیحدہ تیغوں سے دم ہوئے
سب فوج بے نشان ہوئی ٹکڑے علم ہوئے — پوریں جدا جدا ہوئیں نیزے قلم ہوئے
بے آب تیغیں تھیں سپہ بد صفات میں
پانی نہ اتنا تھا کوئی ڈالے دوات میں

خوف اس کا مثلِ تیغِ دو دم کام کر گیا — سمجھا حیات مل گئی جو شخص مر گیا
جب یہ تھمی تو غل ہوا دریا ٹھہر گیا — جب یہ چلی تو زیست کا موسم گزر گیا
یہ گرم رو نظر کی طرح سے جو مڑ گئی
سمجھی یہ دھوپ ایک شرر بن کے اڑ گئی

رن پر چڑھا ہے اسپِ شہِ دیں دمِ جہاد — چوبیں ہی ہیں خیمۂ گردوں کی گرد باد
ہے طرفہ چیز تیغِ شہنشاہِ خوش نہاد — ہے جیسا بہ ہلال زمیں پہ فضا نژاد
کس طرح معجزہ یہ نہیں ساحری نہیں ✱ دریا یہ وہ ہے آب میں جس کے تری نہیں

سب فوج منتشر ہے عجب انتشار ہے ہر تیغ یا ستارۂ دنبالہ دار ہے
جوہر ہر ایک دیدۂ مردم شکار ہے قبضہ بھی اس کا تاج سر افتخار ہے
سب کے سروں پہ چلتی ہے پایہ بلند ہے
ہے ہاتھ میں حسینؑ کے رتبہ بلند ہے

حملۂ امام سے لشکر کا حال تباہ ہونا سب [illegible] طلبی [illegible] پہلوان کی آمد اور موت

ٹھہرے امام دیں جو سنا شور الاماں کاندھے پہ رکھ لی بوجھ کے تیغ شرر فشاں
اک سمت کانپ کانپ کے اونچا ہوا نشاں لشکر سے ڈرتے ڈرتے بڑھا ایک پہلواں
لنگر دیا رکابوں پہ جس دم لعین نے
مشکل سے اُس کا بوجھ سنبھالا زمین نے

ساقی نامہ

ساقی سے کہہ دے کوئی کہ اب دیر کیا ہے آئے ہے کہ یہ مے نہیں اسے خم غدیر لائے
حسرت میں جان جاتی ہے جلدی مجھے پلائے ہوں دردمند دل کے تڑپنے سے ہائے ہائے
ساغر کہاں کا شوق کی تلوار کھائے ہوں
لے ہاتھ میں سبو کہ میں چلو لگائے ہوں

اللہ کا کرم ہے تری ذات ساقیا بزم جہاں ہے بزم خرابات ساقیا
لیتا ہوں تیرا نام میں دن رات ساقیا کیا کہنا تیرا اور تری کیا بات ساقیا
واللہ تیرے قبضہ میں دونوں جہان ہیں
تو مہرباں اگر ہے تو کل مہرباں ہیں

شاہ پر ماریہ میں ابرِ الم چھانے لگے

بند ۱۰۰ (در حال جناب امام حسینؑ)

شاہ پر ماریہ میں ابرِ الم چھانے لگے | شبِ عاشور چلی غم کی خبر پانے لگے
چرخ پہ صبح کے آثار نظر آنے لگے | ہر طرف مرغِ سحر دشت میں چلّانے لگے
دل جو بھر آیا تو اک آہ بھری حضرت نے
کی ادا اُٹھ کے نمازِ سحری حضرت نے

آمدِ صبح

شان وہ صبح کے آنے کی وہ لطفِ صحرا | چترِ زر خسروِ خاور کا افق سے چمکا
کُندنی رنگ کے معشوق کا چہرہ نکلا | کسی محبوب کی ہو زرد قبا کا پردا
زعفراں کا ہے یہ کھیت اس کا ہے غل خلقت میں
گل صد برگ کھلا ہے چمنِ جنت میں

طلوعِ مہر

سُرخی مہر سے روشن ہے کہ ہے شعلۂ نور | نئی صورت سے ہے اب نوح کے طوفاں کا ظہور
سیل کی طرح لگا پھیلنے ہر سمت کو نور | ہر طرف شور ہوا خلق میں فار التنور
ہے یہ طوفان نیا اس میں نئی خوبی ہے
سب نظر آتے ہیں یوں خلقِ خدا ڈوبی ہے

حضرت کا خیمہ سے برآمد ہونا۔

بزمِ انصار میں جب وہ شہِ ذیشاں آیا | دست بوسی کو ہر اک صاحبِ ایماں آیا
ساتھ اصغر کے ہر اک خاصۂ یزداں آیا | حوریں حاضر ہوئیں پابوسی کو رضواں آیا
جوش پر رحمتِ ربّ دوسرا بھی آئی
سب کے سب آئے تو جنت کی ہوا بھی آئی

بہار

پھر بہار آنے میں کیا دیر تھی کھلنے لگے گل | وجد میں لائی درختوں کو صدائے بلبل

خود بخود جوش میں بل کھا گئی اُلفتِ بلبل — مست کرنے لگا گلشن میں طاؤس کا غل

پتیاں قطرۂ شبنم سے نمو پائے ہوئے
کس کی اُلفت میں ہیں ہیرے کی کنی کھائے ہوئے

پوری اُمید ہیں ہوں وقت وہ بار آجائے — پوری پوری نظر آنکھوں کو بہار آجائے
دل عاشق کو تمنا ہے کہ یار آجائے — پیش خیمہ ابھی آیا ہے بہار آجائے

غنچے سب چٹکیں تو باتیں ابھی ساری بن جائیں
جرسِ قافلۂ فصلِ بہاری بن جائیں

کثرتِ گل

ایسی ہے کثرتِ گل جس کا ٹھکانا ہی نہیں — زلزلہ آئے تو اب ہل نہیں سکنے کی زمیں
ڈھیر دم بھر میں پہنچنے کو ہیں تا چرخِ بریں — ہر طرف لوٹ رہی یوں چمن ہے ہیں گل جیسیں

چور مہندی میں ہے بلبل یہی چلاتی رہی
آخر اس بھیڑ میں نرگس کی نظر جاتی رہی

ساقی نامہ

ساقیا جلد بھر لے ترا میخوار ہوں میں — ہوشیاری ہے بڑا عاشقِ سرشار ہوں میں
غیر سے مانگ کے عاصی ترا بے کار ہوں میں — جام دیدے مجھے جب تجھ سے طلبگار ہوں میں

کر کے بے ہوش مجھے ہوش میں لانے والا
کون ہے تیرے سوا میرا اٹھانے والا

خیر پوری نہ کرے میری تمنا نہ سہی — ہے اُلفت مجھے جی بھر کے نہ دیگا نہ سہی
نہر بادہ نہ سہی قلزم و دریا نہ سہی — نہ سہی جام و سبو و خم و مینا نہ سہی

ساقیا تو ذرہ و مقدار کا رتبہ تو ہو
جس قدر تشنہ تھا اس کو اتنا تو ہو

ہاں مگر اجر رسالت کا یہی ہے بادا | کہ عنایت سے مودت جسے خالق نے کہا
اوّل اُن اہلِ قرابت میں تجھی کو پایا | جو طلبگار ہو کرتا ہے خود اللہ عطا

مذہب بندہ نصیری سے جدا ہے ساقی
تو نہ دے خیر ہمارا بھی خدا ہے ساقی

[illegible]

دھوپ نکلی کہ ہوئے حشر کے آثار عیاں | بیٹھے تھے خیمۂ انصار میں سلطانِ زماں
خبر آئی کہ ہے تیار اُدھر فوجِ گراں | قتل سادات کا سب آ گیا رن میں ساماں

باجے بجتے ہیں زمیں دشت کی تھراتی ہے
بڑھ کے ڈنکے کی صدا کوہ سے ٹکراتی ہے

یہ خبر سنتے ہی سب جاں دم سرکار اُٹھے | جانیں آقا پہ فدا کرنے کو انصار اُٹھے
بگڑے عباسِ علی ٹیک کے تلوار اُٹھے | دیکھ کے شیر کا غصہ شہِ ابرار اُٹھے

آپ اُس وقت بھی اعدا پہ ترس کھانے لگے
ہاتھ شانے پہ دھرا بھائی کو سمجھانے لگے

توصیف فرس امام

اس کو خالق نے دیا مرتبہ کیا اس میں کلام | ہے پیمبر کا فرس اور سوار اس پہ امام
گر یہ تشبیہ ہو عفو کرے ربِّ انام | دو یہ قرآن کی سطریں ہیں کہ ہے اس کی لگام

حوریں ہر مرتبہ لیتی ہیں بلائیں اس کی
حلقۂ چشمِ ملک دونوں رکابیں اس کی

جان اس گھوڑے میں اور تیغِ علی میں ہے بہم | قدم اس کے کبھی چوموں یہ ہوا کو ہے ہوس
زد پہ جو آیا تو پامال کرے گا یہ فرس | ہر طرارے پہ صدا دیتے ہیں اعدا بس بس

رحم آتا ہے جو سب خوف سے چلاتے ہیں * آپ باگوں کو بہت کستے ہوئے آتے ہیں

تلوار کی تعریف

تو جوہیں ہنسنے لگیں گلبن غنچے سلفی دہاں   برچھیاں اُٹھیں کہ ٹکنے لگی ہر ایک کماں
قبضہ تک ہاتھ کا آنا تو ہوا سب پہ عیاں   یوں چلی تیغ کھلے جیسے سخنور کی زباں

جلد تر اپنے کو اپنوں سے چھڑا کے نکلی
میان سے نکلی چمک بعد یہ پہلے نکلی

موت کہتی ہے ترے سامنے میں ہوں کس کن میں   گو کہ ہے فرق مرے جان مرے تیرے سخن میں
اے جی نے نہیں لیں اور نہیں جانیں ان میں   سچ بتا مجھ کو بتا دے گی یہ فن کس دن میں

جب کہ دنیا ہوئی ہے خلق میں جب آئی ہوں
تجھ نہ آیا تو سمجھتی ہوں کہ اب آئی ہوں

کھل گیا صاف کہ ہے تیر اجل اور یہ جوان   اس کا کھنچنا ہے کہ ہے جنگ جدل کا اعلان
سچ یہ ہے قابل تحریر ہے جو اس کی شان   جوہر اس میں ہے کہ لکھا ہوا باریک قرآن

شاہ کھاتے ہیں قسم بخشش اُمت کے لیے
کہ اُٹھایا ہے اسے آج شہادت کے لیے

شہادت امام حسین و بیتابی جناب زینب کی فریاد اہل قریہ سے بہ درد انگیز خطاب

رن میں جب وقت ہوا قتل شہیدوں کی کا   ننگے سر خیمہ سے زینب نکل آئیں اک بار
شاہ ابرار کی گردن پہ جو دیکھی تلوار   پسر سعد سے کہنے لگیں او نا ہنجار

تہِ خنجر دل محبوب خدا ہے ظالم
وائے ہو تجھ پہ کہ تو دیکھ رہا ہے ظالم

کبھی قریوں کی طرف دیکھ کے دیتی تھیں صدا   اے عرب والو حمیت نہیں اے اہل قرا
تم میں مہمان بنی دلبند رسول دوسرا   کس سے فریاد کریں کوئی بھی باقی نہ رہا

اب طلبگار رہوں امداد کی کس سے جا کر * دیکھو ہم لُٹ گئے بستی میں تمہاری آ کر

حالِ زینب کا جو کچھ تھا نہ دکھائے داور
ساتھ کھنچتی ہوئی جاتی تھی زمیں پر چادر
دوڑ کے جاتی تھیں اس سمت کبھی گاہ ادھر
خاک پر بیٹھ کے آخر یہ پکاریں مضطر

مورد رنج و غم و درد و پریشانی ہوں
امتی لوگو خبر لو کہ میں سیدانی ہوں

محضرِ خونِ شہیداں ہے مرادامنِ دل

بند ۹۶ (در حالِ امامؑ)

صبحِ عاشور کا معکوس اثر

صبحِ عاشور کی جب دشت میں تنویر ہوئی — لیلیٔ شب کی جوانی نہ رہی پیر ہوئی
رن میں جو شب تھی وہ اک نور کی تصویر ہوئی — دل جلے سرد ہوا میں نئی تاثیر ہوئی

یوں ہلے برگِ شجر شورِ فغاں اٹھنے لگا
شبنم اڑنے لگی آہوں کا دھواں اٹھنے لگا

نمازِ سحر اور مرتبۂ انصارِ عبادت گزار

ہوئے مشغول نمازِ سحری میں سرور — پیچھے صف باندھے ہوئے سارے عزیز و یاور
سب کے سب ثانیٔ مقداد و تمیم و بوذر — رتبہ میں فرش سے کعبہ کے مصلے بہتر

متوجہ ہوئے حق قلب و جگر تھے ان کے
پاؤں تھے فرش پہ اور عرش پہ سر تھے ان کے

طلوعِ آفتاب

تاجِ زریں سے ہوا جب سرِ گردوں پُر نور — خضر نے چاہا کہ قلزمِ اخضر سے عبور
رنگ وہ چرخ کا وہ مہر کا مشرق سے ظہور — شیر کا چہرہ نظر آتا تھا سبزہ میں دور

کوئی معشوق بصد شوکت و ناز آتا ہے
سرخ بیرق ہے سمندر میں جہاز آتا ہے

کیفیتِ صبح قدرتی مناظر

پھول کھلنے لگے بلبل کی صدا آنے لگی — کہ نظر باغ کی صحرا میں فضا آنے لگی
غنچۂ گل ہونے لگے بادِ صبا آنے لگی — ٹھنڈی ٹھنڈی لبِ دریا سے ہوا آنے لگی

بچے ہر مرتبہ آقا کی طرف مڑنے لگے
زلفیں ہلنے لگیں دامانِ قبا اڑنے لگے

جس کو نے فصلِ بہار آنے کی نکہت پائی — اور گل بن گیا جس نے یہ دولت پائی

پانی کے زور سے فوارہ نے قوت پائی — دست و پا پیلوں نے پھیلائے یہ راحت پائی

ہے سکوں سب کو ہر اک امر میں آسانی ہے
آئینہ جو کھٹے میں نہر میں پانی ہے

ہے جوانانِ چمن کی ہر ادا خوش اسلوب — کیسے خوش رنگ لباس اُن کے ہیں وہ شکلیں مرغوب
بلبلیں باغ میں طالب ہیں تو گل ہیں مطلوب — سایۂ شمشاد کا ہے روکشِ قدِ محبوب

بدلی آ آ کے جو ہر بار بہرک جاتی ہے
کہیں دھوپ اور کہیں چھاؤں نظر آتی ہے

جا بجا پھولوں کے انبار ہیں جس طرح پہاڑ — اب تو کیسی ہی خزاں آئے نہ گلشن ہو اُجاڑ
ہے ملاپ آج نہیں ہے گل و بلبل میں بگاڑ — بیٹھی ہے جا کے قریں دیکھ کے پتوں کی آڑ

ہائے صیاد کی آہٹ جو ذرا پاتی ہے
سیکڑوں باتیں سُناتی ہوئی اُڑ جاتی ہے

حال بلبل کے زندہ رہنے کا وقت آمد صیاد دل بلبل دہلنا زبان حال سے شعار ناری کی

باغ میں فصلِ بہار آئی کہ ایامِ شباب — باغباں سے ہوئی خوش ہو کے نہ دیگل کا حجاب
حُسن کے واسطے سنبل کو دیا پیچ و تاب — اس طرح سبزہ کو روندا کہ ہوا وہ شاداب

نازدیکھو کہ جدھر بادِ بہار آ کے چلی
تو ہر اک غنچہ کو ہر پھول کو ٹھکرا کے چلی

وہ سماں صبح کا کہنا میں طاؤس کا شور — تارے چھپنے میں نظر آنے لگے دیدۂ مور
ایسا دکھلا رہی ہے فصلِ بہار اپنا زور — دیکھتے دیکھتے نرگس کی ہوئیں آنکھیں کور

صبح اور نرگس شاعری ... نظارہ ... کی کیفیت

کیفیت ایسی اُدھر تھی کہ اُدھر پھیر نہ سکی
پہونچی تو چہرۂ ہر گل پہ نظر پھیر نہ سکی

اس قدر کثرتِ گل ہے کہ نہیں جس کا حساب
بس یہی جانتی ہوں یہ جان کہ پیا ہے عذاب

سُتی مہندی کی ہر اک بیلا یہ کرتی ہے خطاب
دمبدم فصلِ بہاری اُسے دیتی ہے جواب

شوق پسنے کا ہے ہر دم اسی تدبیر میں ہے
روزِ اول ہی سے پسنا تری تقدیر میں ہے

آتشِ گل سے نہیں بلبلوں کو کچھ بھی ضرر
عشق میں باعثِ دلگیری ہی کا ہے اثر

ہے سزاوار اسے بھی کہیں گر آتشِ تر
گل ہر ایک شعلہ سے بڑھ کر ہے جلنے نہیں

عشق کس طرح نہ ہو کیوں نہ کریں خواہشِ گل
کہ عنادل کے عناصر میں بھی ہے آتشِ گل

قطرے شبنم کے ہر اک سمت ہزاروں ہیں عیاں
جوہری آتے ہیں ہو کے میں میانِ گلستاں

ہیں شجر سارے مرصع یہی ہوتا ہے گماں
ابرِ نیساں کا بھلا کون اُٹھاتا احساں

کیسے ہیں فصلِ بہاری نے یہ جوہر پیدا
کہ درختوں میں بھی ہونے لگے گوہر پیدا

چال ہے بادِ صبا کی کہ ہیں بیتاب شجر
کبھی اس گل پہ عنایت ہے کبھی اس گل پر

دمبدم لیتی ہے گلزار اک اک کی خبر
کبھی جاتی ہے اُدھر اور کبھی آتی ہے اِدھر

شوق میں لوٹتے ہیں برگِ خزاں دیدہ بھی
کروٹیں لے رہا ہے سبزۂ خوابیدہ بھی

جب عزیزوں سے شہنشاہِ اُمم چھوٹ گئے
ایک مدت سے جو رشتے تھے بہم چھوٹ گئے

سب غلاموں سے بھی آقا کے قدم چھوٹ گئے
رو کے فرماتے تھے احباب سے ہم چھوٹ گئے

لاشے جو سد رشتے تھے جانِ حزیں گھٹتے تھے * آہیں کرتے تھے کبھی اور کبھی روتے تھے

جنابِ امام حسین
عالمِ تنہائی میں
ہر عزیز کی نعش کو
تمام بنا متواتر
دیکھتے تھے اور
مردوں کو چھٹتے تھے

کبھی دل تھام کے چلاتے تھے اکبر اکبر
غم جو عباس کا تھا تھامے تھے ہاتھوں سے کمر
مضطرب ہوتے تھے جب جاتی تھی لاشوں پہ نظر
دل کو اس ہاتھ سے اُس ہاتھ سے تھامے تھے جگر
جوشِ غم تھا کبھی اُٹھتے تھے کبھی گرتے تھے
دل نہ تھمتا تھا تو بیتاب پڑے پھرتے تھے

کبھی لاشوں کی طرف دیکھ کے کرتے تھے کلام
اے زبیرا بغم و اندوہ سے ہے کام تمام
اے حبیب آؤ گلا کٹنے کا آیا ہنگام
سب کے سب میری خبر لو میں تنہا رہا ہوں امام
مطمئن ہو دلِ خستہ جگر آواز تو دو
نہ اُٹھو میری مدد کو مگر آواز تو دو

امام حسینؑ کا رن میں آنا۔ صفت اسپ امامؑ

چال اس طرح کی ہے پریوں کے دل ملتی ہے
یہ بلا وہ ہے کہ ٹالے سے نہیں ٹلتی ہے
کستا ہے سینہ سے یہ نکل جو ذرا چلتی ہے
تیز کچھ بھی نہیں کہنے کو ہوا چلتی ہے
ناز و اعجاز دکھانے پہ اگر آئے ابھی
چشمِ سوزن سے نگہ بچ کے نکل جائے ابھی

آ کے میدان میں ٹھہرے جو شہنشاہِ زمن
آئی آوازِ تکبیر اور ہوا شورِ بزن
چوٹ ڈنکے پہ لگی گونج گیا سارا رن
دشت سے چوکڑیاں بھر ہوئے شیر ہرن
واں جو ہر ظالم و گمراہ کے تیور بدلے
یاں بھی شیرِ اسد اللہ کے تیور بدلے

تیغِ حسینی کی تعریف

ہے خدا داد یہ تیغ اس کا بھلا کہنا کیا
پھل ہے قبضہ میں کہ نکلا ہے یہیں سے دریا
آب کی طرح سے مشہور ہے اس کا بڑھنا
جو قریب اس کے ہوا اُس سے بھی ہو گئی جدا
تیز چلنے کی صفائی کی کبھی خو نہ گئی * اس طرح نکلی کہ کاٹی بھی کبھی چھو نہ گئی

کس کا منہ ہے جو بڑھے یا سوئے شمشیر چلے | جس کو جانا ہو سوئے نار وہ بے پیر چلے
یوں تو تلواریں چلیں نیزے چلے تیر چلے | تھیں صفیں صاف جدھر حضرت شبیر چلے

ایک کو بھی ہنر جنگ دکھانے نہ دیا
ہاتھ اٹھنا تو کہاں سر بھی اٹھانے نہ دیا

کشتیِ تیغ چلے فوج کا دریا گھٹ جائے | کیا عجب آج اگر قعرِ جہنم پٹ جائے
کہہ و میدان سے ہر ایک فرشتہ ہٹ جائے | شل جبریل کوئی پر نہ کسی کا کٹ جائے

اور نزدیک اگر فوجِ شر آجائے گی
سب کو خیبر کی لڑائی نظر آجائے گی

تیغ جب بڑھتی ہے سب فوج سرک جاتی ہے | یہ وہ شعلہ ہے کہ تا چرخ لپک جاتی ہے
وہ ادا ہے کہ ہر اک روح پھڑک جاتی ہے | رن سے اس برق کی کوندے میں چمک جاتی ہے

ہوش گم کر دیے ہیں یوں دمِ پیکار چلی
لوگ کہتے ہوئے جلتے ہیں کہ تلوار چلی

ساقی نامہ پڑھنے والے کو مست کر دینے والے خیالات

اُسی ساقی سے رہی چشمِ کرم عالم کو | اپنا میکش کیا عیسیٰ کو ابنِ مریم کو
بادہ عشق سے سرشار کیا آدم کو | بخشو لب کے لیے دی مئے الفت ہم کو

نشہ اُس روز کا ہم سب کو ابھی باقی ہے
محفلِ دلِ اسلام کا وہ ساقی ہے

کس طرح ہوتی ہے یا عمر بسر دیکھ تو لے | ہو چکا حال بہت سخت دگر دیکھ تو لے
تشنہ دید کو اب ایک نظر دیکھ تو لے | بھر چکا جام مرا پھیر کے ادھر دیکھ تو لے

وقت آخر ہے خوش انجام ہے ناکام لے چھوٹا ہوتوں پہ دم آئے ادھر جام چلے

ساقیا وہ الفت سے چھٹے ہیں شاید
مے کشی گر یہ گنہ ہو تو کریں استغفار

کسی عالم میں بہکتے نہیں تیرے میخوار
کہے دیتے ہوں کہ سمجھائے نہ کوئی زنہار

جوش میں جام سے شیشے ابھی ٹکرائیں گے
نام توبہ کا سنیں گے تو بگڑ جائیں گے

اصل کیا خُم کی بھلا ساغر و مینا کیا ہے
چیز کیا پیر مغاں ساقیٔ دنیا کیا ہے

کیا سمجھتا ہوں مئے ناب کا دریا کیا ہے
کیوں کسی در سے مانگوں مجھے پروا کیا ہے

دل میں آئے گا تو بھر دے گا کبھی جی میرا
میں جیوں اور سلامت رہے ساقی میرا

عباسؑ نے جب رن کی رضا شاہ سے چاہی

بند ۱۰۴ (در حال جناب عباسؑ)

طلب اجازت جناب عباسؑ پر امام حسینؑ افسوس فرماتے ہیں اور کہتے ہیں۔

افسوس ہے اتنے برس تک جنھیں پالا — وہ مرنے کو جاتے ہیں یہ انداز نکالا
دو روز بھی گھر بعد ہمارے نہ سنبھالا — کس طرح کی فصل آئی ہے اللہ تعالےٰ
جو قوتِ بازو تھے وہی چھوڑ چلے ہیں
تھا جن سے قوی دل وہی دل توڑ چلے ہیں

ہم نے کسی عالم میں کسی کو نہیں چھوڑا — راحت ہوئی یا رنج کبھی منہ کو نہ موڑا
جس امر کی ضد کی وہ کیا دل نہیں توڑا — پر اب غم و اندوہ سے دل ہو گیا پھوڑا
ہم کچھ بھی بحالِ خفگی کہہ نہیں سکتے
لیکن یہ جدائی کا قلق سہہ نہیں سکتے

برادر عالی شان اور طلب نصرت کا شانت آمیز لہجہ

اے بحرِ کرم میرِ امم اے شہِ جمہور — خادم قدمِ پاک سے ہوتا نہ کبھی دور
ہیں امر وہ درپیش کہ اس وقت ہوں مجبور — خوشنودیِ حق دین کی تائید ہے منظور
اس بات سے خوش ہوتے ہیں ماں باپ بھی آقا
فرمائیں نہ اس باب میں عذر آپ بھی آقا

امام حسینؑ کا حضرت علی اکبرؑ سے پہلے اجازت دینے کا ارادہ اور جناب عباسؑ کا اصرار اپنے لیے

ارشاد کیا شاہ نے اے حق کے فدائی — میں بھی تو کسی وجہ سے مجبور ہوں بھائی
ہو کون مددگار جو ہو تم سے جدائی — مجھ کو بھی تو منظور ہے اب وعدہ وفائی
اندر ہیں نہ لشکر روکنے والا تو کوئی ہو
پردے میں بٹھائے انھیں ایسا تو کوئی ہو

حاملِ علمِ فوج کے ہو تم مرے غمخوار — اکبر سے کہو جائیں سوئے لشکرِ کفار

کی عرض یہ سرور سے یا سید ابرار
لازم ہے کہ سردار کے آگے ہو علمدار
پہلے مرے مرنے کا ہو قتل فوج لعیں میں
مختار ہیں پھر جائیں یہ فردوس بریں میں

اس کو طرف فوج ستم جانے نہ دونگا
خود جاؤں گا پر سوئے عدم جانے نہ دونگا
پہلے کبھی یا شاہ امم جانے نہ دونگا
ہیں آپ کے قدموں کی قسم جانے نہ دونگا
مالک پہ نہ صدقہ ہو ملازم سے نہ ہوگا
یہ خوش ہوں کہ ناراض یہ خادم سے نہ ہوگا

محبت برادر

ان باتوں پہ آیا جو شہ دیں کو بہت پیار
قدموں کی طرف جھک گئے عباس علمدار
لپٹا کے گلے رونے لگے سید ابرار
شہ نے کہا ہاں ہاں مرے مونس مرے غمخوار
طاقت ہے نہ اب صبر کا مقدور ہے مجھ کو
پر جس میں ہو تم خوش وہی منظور ہے مجھ کو

بعد طلب رخصت حضرت عباس کا خیمہ میں جانا اور زوجہ سے گفتگو [illegible]

کپڑے جو بدلنے لگا وہ شاہ کا شیدا
بولے کہ ہے جنت کی طرف قصد سفر کا
زوجہ نے کہا روکے کہاں کا ہے ارادہ
ممکن نہیں میدان سے پھر کر مرا آنا
فوجیں نہ بڑھ آئیں کہیں اندھیر نہ ہو جائے
کہنا ہو جو کچھ جلد کہو دیر نہ ہو جائے

بولیں کہ خدا کے لیے مرنے کو نہ جاؤ
روتے ہیں پسر دونوں کو نزدیک بلاؤ
صاحب ہمیں پردیس میں بیکس نہ بناؤ
شفقت سے انہیں پیار کرو پاس بٹھاؤ
گھر سے نہ نکل جائیں کہیں بعد تمہارے
مجھ سے یہ سنبھلنے کے نہیں بعد تمہارے

چلائیں نہ کیونکر کہ بلا آتی ہے سر پر — اس وقت تو قابو ہے نہ دل پر نہ جگر پر
کس قہر کی آتی ہے تباہی مرے گھر پر — روتی ہوں کہ بس ہے فقط اک دیدۂ تر پر
لونڈی ہوں کسی طرح کی عزت نہیں رکھتی
روکوں تمہیں اتنی بھی لیاقت نہیں رکھتی

آقا سے کہوں آپ انہیں روکیے یا شاہ — فرمایا کہ ایسا نہ کہیں کیجیو للہ
میں اپنا گلا کاٹ کے مر جاؤں گا واللہ — باعث یہی عزت کا ہے کیا تم نہیں آگاہ
دامن کہیں تم بہر خدا تھام نہ لینا
جاتا ہوں میں اب رکنے کا نام نہ لینا

جناب عباس کا صحن میں تشریف لانا اور جناب سکینہ کی گفتگو

جب صحن میں آیا وہ یداللہ کا جانی — شاہ شہدا کرنے لگے اشک فشانی
کی بیبیوں نے باندھ کے صف مرثیہ خوانی — دی مشک سکینہ نے کہ لا دو ہمیں پانی
تھا باتوں پہ ناداں کی غل آہ و بکا کا
ضد کر رہی تھیں ہاتھ میں دامن تھا چچا کا

یہ کہتے تھے دم بھر کی مصیبت ہے یہ جھیلو — دیتی تھی پھر جائیو پانی مجھے دے لو
یہ کہتے تھے قربان چچا بچوں میں کھیلو — وہ کہتی تھی مانوں گی نہیں گود میں لے لو
گودی میں نہیں تھامے ہوئے ہاتھ چلوں گی
پیاسی ہوں بہت نہر پہ میں ساتھ چلوں گی

عزم میدان شاہ جناب عباس

چومے قدم شاہ چڑھا گھوڑے پہ غازی — باگ اٹھتے ہی طاؤس جناں بن گیا تازی
سرعت نے دکھائی یہ نئی شعبدہ بازی — خود ہو گئی کوتہ رہ میداں کی درازی
اعدا سے نگہ صاحب شمشیر نے بدلی * جب سامنے صید آئے نگہ شیر نے بدلی

شوکت وہ علمدار کی وہ شان علم کی
آواز بھی آتی نہیں گھوڑے کے قدم کی
تلوار کی بجلی کبھی ٹھہری کبھی چمکی
پامال ہوئی جاتی ہی سب فوج ستم کی
ہی سرخ زمیں خون جو اعدا کا بہا ہے
وہ شیر کے نعرے ہیں کہ رن گونج رہا ہی

جس نے انھیں ٹوکا اُسے زندہ نہیں چھوڑا
اُس ہاتھ میں ہی باگ نہ اِس ہاتھ میں گھوڑا
فوجیں ہیں بہت گرد مگر دل نہیں تھوڑا
جس سمت نظر پھرتی ہی پھر پڑتا ہی گھوڑا
کیوں کر نہ اشارے میں ہو وہ خوش سیران کے
گویا کہ لگام اُس کی ہی تارِ طیران کے

توصیف فرس خوش خرام

اُڑتا ہی فرس بن گئے ہیں دامنِ زیں پر
ہر نعل کا پرتو مہِ نو چرخ بریں پر
رکتا ہی کسی سے نہ ٹھہرتا ہی کہیں پر
کھلتے ہیں گلِ نقشِ قدم رن کی زمیں پر
ہی بلبلِ شیدا بھی مقر جلوہ گری کی
کیا چال اُڑائی ہی نسیمِ سحری کی

اس رخش کو جا بس سا ہوا آ سنبھالے
نرغہ میں جہاں پہلوؤں سے مل گئے بھالے
دوڑے جو صبا ساتھ پڑیں پاؤں میں چھالے
رہوار نے گویا پر پرواز نکالے
سب شامیوں سے بھر کے طرارا نکل آیا
شب ختم ہوئی صبح کا تارا نکل آیا

صفت شمشیر

شہ تیغ کا ہی رشتۂ جاں کے لیے مقطع
ہی حق کی عنایت سے کل اوصاف کا مجمع
مہرِ فلکِ فتح و ظفر کا ہی یہ مطلع
جوہر کے جواہر سے ہوئی ہی یہ مرصع
ہوتے ہیں رواں قافلے ارباب جفا کے * نابیں نہیں جاتے ہیں یہ صحرائے فنا کے

ہے تیز روانی میں کہ ہے سیلِ فنا سے ۔۔۔ ہر مرتبہ آگے ہے وہ چلنے کی صدا سے
جھک جھک کے گلے ملتی ہے اربابِ جفا سے ۔۔۔ جب بڑھ کے ذرا چلتی ہے کہتی ہے قضا سے
رُکتی نہیں روکیں کہ ستمگار نہ روکیں
اللہ کرے ہاتھ علمدار نہ روکیں

بہروا میں گر گر کے لعینوں کا پھڑکنا ۔۔۔ سب ناریوں پہ تیغ کے شعلہ کا لپکنا
وہ زیرِ علم چہرۂ تاباں کا چمکنا ۔۔۔ اُڑنا وہ پھریرے کا وہ پنجہ کا لچکنا
تھا شور یہ ساعت بھی سدا یاد رہے گی
یہ شان یہ شوکت یہ وغا یاد رہے گی

دو چار صفیں جب تہِ تیغِ دو سر آئیں ۔۔۔ مسدود جو تھیں جنگ کی راہیں نظر آئیں
اب ہاتھ جا ضربیں تھیں اب زور پہ آئیں ۔۔۔ یوں اُنگلیاں لپٹی ہیں کہ قبضہ میں نہ آئیں
واعقدۂ جاں کر دیا ہر ایک شقی کا
پھل تیغ کا ترشا ہوا ناخن ہے علی کا

پھر بھر کے لہو میں ہوئی تیغِ دو سر آتش ۔۔۔ کرتی نہیں دریا کو مضرت مگر آتش
ہے ناریوں کا خون کہ شعلہ ہے در آتش ۔۔۔ ہے بیچ میں پانی اِدھر آتش اُدھر آتش
غصہ کی حرارت ہے جو یہ حال ہوا ہے
ہے گرمیِ رفتار کہ مُنہ لال ہوا ہے

جس سمت وہ گزری۔ لاشوں سے زمیں پاٹ کے اُٹھی ۔۔۔ فوجوں پہ جھکی یاں تو قریں گھاٹ کے اُٹھی
مُنہ اودکھلا جب وہ لہو چاٹ کے اُٹھی ۔۔۔ سر کیا ہے زمیں کا بھی طبق کاٹ کے اُٹھی
غصہ ہے یہ سُرخی ہے کہاں خونِ عدو کی ✱ جوہر نظر آتا ہے ہر ایک بوند لہو کی

اب میاں سے تیغوں کو نکلنے نہیں دیتے — عاجز ہے کماں تیر کو چلنے نہیں دیتے
پیدلوں بھی پیادوں کو بدلنے نہیں دیتے — گھوڑوں پہ سواروں کو سنبھلنے نہیں دیتے
لاکھوں کو دمِ تیغ زنی ٹوک رہے ہیں
بڑھتا ہے جو غصہ تو اُسے روک رہے ہیں

حضرت عباس کا نہر پر قبضہ

عباس کی صورت ہے کہ ہے قدرتِ باری — دریا کو یہ حیرت ہے کہ پانی نہیں جاری
دامن کی ہوا بن گئی ہے بادِ بہاری — اب اور قریب آ گئی ہے بڑھ کے سواری
نزدیک جو ہے نہر کلی دل کی کھلی ہے
ہر موج کی کشتی کہ کنارہ سے ملی ہے

بجوشِ شجاعت ہیں لعوبِ غیرت

ہم گھاٹ تک آئے نہ کوئی سامنے آیا — شمر و عمرِ سعد نے بھی مُنہ نہ دکھایا
ہم نے تو لڑائی کا مزا خاک نہ پایا — دریا پہ بھی ڈھالوں کا سیہ ابر نہ چھایا
کیا نہر کا اب بھی مزے آجانے میں شک ہے
تیغوں کی چمک ہے نہ کمانوں کی کڑک ہے

دم لے کے بڑھے حضرتِ عباس دلاور — رہوار کو ٹھکرا کے گئے نہر کے اندر
دریا بہت دور نظر آتا تھا لشکر — دی بڑھ کے صدا مشک جو بھرنے لگے جھک کر
تم یہ نہ سمجھنا کہ پیے جاتے ہیں پانی
لو روکنے آؤ کہ لیے جاتے ہیں پانی

واپسی طرف خیمہ او جانا بہت مشک

ہر سو سے چلے آتے ہیں سب اہلِ ستم ہائے — لڑتے ہوئے میداں سے چلے آتے ہیں عباس
ہے خوف نہ کچھ جان کے جانے کا ہے وسواس — پانی کے پہونچنے سے مگر ہو گئی ہے یاس
نیزوں سے جدا اہلِ ستم لڑ کے ہوئے ہیں ✱ یہ مشک سکینہ پہ سپر ہو کے ہوئے ہیں

بنتِ حسینؑ کا اطفالِ تشنہ دہاں کے پیاس کی شدت کا اظہار۔

گذرے ہیں کئی روز کہ پیاسی ہے سکینہ
غم ایسے ہیں دل پہ کہ مجھے شاق ہے جینا
تیروں سے عوض مشک کے چھانو مرا سینہ
اے ظالمو بچوں سے نہیں چاہیے کینا
ہے قوتِ دل راحتِ جاں سبطِ نبی کی
پیاری وہی بیٹی ہے حسین ابنِ علی کی

چشمِ بد کا تیر لگ کر مشک میں سوراخ ہونا اور عباسؑ کا بچوں کی تقدیر پر تاسف کرنا

کیا کھینچ سکیں ہاتھ نہیں رنج ہے طاری
تھا فکر میں اس تیر کی وہ عاشقِ باری
مشکیزہ میں سوراخ ادھر کر گیا ناری
پانی جو بہا آنکھ سے آنسو ہوئے جاری
اس مشک کو اشکوں سے بھگویا کیے عباس
ان پیاسوں کی تقدیر پہ رویا کیے عباس

حضرت عباسؑ کا وقتِ آخر امامؑ کو آواز دینا۔

دی شاہ کو آواز کہ جلد آیئے بھائی
مشتاق ہوں صورت مجھے دکھلایئے بھائی
تکلیف مرے واسطے فرمایئے بھائی
اعدا ہیں بہت پاس ہٹا جایئے بھائی
خادم کا بھی قاسم کی طرح حال نہ ہو جائے
آقا یہ غلام آپ کا پامال نہ ہو جائے

امام حسینؑ میں حالتِ بیتابی تشریف لاتے ہیں۔

اے اہلِ ستم میرا مددگار کدھر ہے
کیوں بھائیو وہ عاشقِ سرِ شاہ کدھر ہے
جس پر یہ چلی ظلم کی تلوار کدھر ہے
یارو مرے لشکر کا علمدار کدھر ہے
بتلا دو کہاں صاحبِ شمشیر کو مارا
کس دشتِ مصیبت میں مرے شیر کو مارا

جب شبِ قتلِ شہِ دیں کی سحر ہونے لگی

بند ۱۴۰ (در حالِ جنابِ حُرؑ)

شب عاشور تردد میں بسر کی حُر نے — بیم و اُمید کے عالم میں بسر کی حُر نے
عبد و فرزند و برادر پہ نظر کی حُر نے — من و عن اپنے ارادے کی خبر کی حُر نے

گو نہ کچھ جبر کیا اور نہ اصرار کیا
سب نے آقا پہ فدا ہونے کا اقرار کیا

مرحبا کہہ کے اُٹھا جلد وہ شیدائے امام — دوڑ کر پانی وضو کے لیے لے آیا غلام
حُر نے کی آہ کہ پیاسے ہیں شہنشاہِ انام — دل یہ بھر آیا کہ آنکھوں سے چھلکنے لگے جام

خیر رو رو کے وضو کر لیا ناچاری سے
پڑھ لیں دو رکعتیں خوفِ غضبِ باری سے

سوچ کر کہنے لگا خیر میں سمجھا مطلب — دیر سے فکر میں تھا ذہن مرا پہنچا اب
نوکری جاتی رہے گی مجھے اس کا ہے تعب — بولا حُر۔ اب کسی مردود کا نوکر ہوں میں کب

دونوں ملعون ہیں مردود بھی ہیں ظالم بھی
تو بھی اک فاسق و فاجر ہے ترا حاکم بھی

میرا آقا ہے دل و جانِ رسولِ عربی — فخرِ والا حسبی مالکِ عالی نسبی
فاطمی و قرشی ہاشمی و مطلبی — بے وضو نام نہ لے کوئی کہ ہے بے ادبی

سارے آئینہ ہیں اسرارِ سماوات اُن پر
خوب آگاہ ہے تو ختم ہے ہر بات اُن پر

بس خبردار نہ کچھ کہیو ابے نافرجام — تجھ سے بیہودہ سے بیکار ہے مجھے کو کلام

بے ادب کہنے لگا جلد زباں اپنی تھام — حکم دیدوں کہ تجھے گھیر لے یہ لشکرِ شام
ابھی اسوار کمندوں میں جکڑ لیں تجھ کو
یہ پیادے مرے لشکر کے پکڑ لیں تجھ کو

سُن کے یہ حُر کے برادر نے جو بدلے تیور — پھر کے فرزند نے کی تیغ کے قبضہ پہ نظر
میاں سے عبدِ وفادار نے کھینچا خنجر — جا کے خیمہ میں چھپا بھاگ گیا وہ خودسر
حُر نے دیکھا کہ قیامت کا ہے غصہ سب کو
ابھی موقع نہیں ہے۔ کہہ کے یہ۔ روکا سب کو

غیظ میں جھوم رہا تھا وہ نجیب الطرفین — ناگہاں دیکھا کہ رانوں میں ہے گھوڑا بے چین
دی صدا حُر نے کہ اے دشمنِ اولادِ حسین — لے میں جاتا ہوں سوئے ابنِ شہِ بدر و حنین
جن سواروں پہ تجھے ناز ہے ٹوکیں مجھ کو
او لعیں کہہ دے پیادوں سے کہ روکیں مجھ کو

یوں اُڑا وہ کہ دلِ طائرِ سدرہ پھڑکا — اور کڑکا وہ کمانوں کا سنا جب کڑکا
ساتھ چلنے میں ہوا کا بھی کلیجہ دھڑکا — روکنا چاہا تو شعلہ کی طرح سے بھڑکا
غل ہوا فوجِ عدو میں کہ جری جاتا ہے
اُٹھ کے کرسی سے کہا شاہ نے حُر آتا ہے

گئے پھر پھر کے تعاقب میں جو آتے تھے سوار — شوقِ پابوسیٔ شہ میں ہوئے گھوڑے پروا
فوج سے بچ کے نکل آئے بچا کر جرّار — فرسِ حُر نے قریب آکے بدل دی رفتار
اب جو دیکھا تو حواس آئے ہوئے جاتے ہیں
سامنے حضرتِ شبیر نظر آتے ہیں

دی صدا حر نے کہ محبوبِ الٰہی کے حبیب
بحرِ عصیاں کے تلاطم میں پھنسا ہے یہ غریب
ناخدا تجھ سا ملا کھل گئے بگڑے کے نصیب
المدد اب مری کشتی ہے کنارہ کے قریب

تو اگر چاہے تو چک جائے بکھیڑا میرا
پار ہو جائے ترے لطف سے بیڑا میرا

خود پکارے شہِ دلگیر کہ آ بخش دیا
جو گنہ تھا برسولِ دوسرا بخش دیا
لے خدا نے بھی ترا جرم جو تھا بخش دیا
باغِ جنت تجھے اے ماہ لقا بخش دیا

تذکرہ ہوگا سدا اہلِ وفا میں تیرا
نام موجود ہے فردِ شہدا میں تیرا

سن کے یہ پاؤں سے لپٹا جو حُرِ نیک سرشت
پشت پہ ہاتھ دھرا کہہ کے مبارک ہو بہشت
حُر نے کی عرض اسی واسطے چھوڑا ہے کنشت
نیچے ان قدموں کے مل جائے زمیں دو بالشت

کفن اس دستِ کرم سے جو عنایت ہو جائے
مجھ سے عاصی کے لیے حلۂ جنت ہو جائے

رشید اور قصیدہ

غزل کے لیے سادگی زبان۔ خوبی محاورات۔ نزاکت خیال کی ضرورت ہی۔ مثنوی کے لیے واقعہ نگاری۔ طرز بیان تعلق و ترتیب درکار ہی۔ اسی طرح ہر صنف سخن ایک خاص طرز کی محتاج ہی۔ برخلاف ان سب کے قصیدہ کے لیے۔ زور الفاظ۔ چستی بندش۔ بلندی خیال۔ سلاست تراکیب۔ درستی تشبیب۔ حسن گریز ایسی چیزیں ہیں جن کے بغیر قصیدہ قصیدہ نہیں رہتا بلکہ اور کچھ ہو جاتا ہی۔ اگر کسی قصیدہ گو میں مذکورۂ بالا سب اوصاف کم و بیش موجود نہوں۔ یا دو ایک ہوں تو اہل فن کے نزدیک قصیدہ گو کا اطلاق تو اُس پر صحیح ہو جائیگا مگر پھر بھی اُس میں یہ صنف سخن ناقص تصور کی جائے گی +

کامل قصیدہ گو | شعرائے اُردو میں مرزا رفیع سوداؔ نے قصیدہ کو قصیدہ کی حیثیت سے کہا اور اُن کے قصائد بے شبہ اُن سب خوبیوں کے مجموعہ ہیں۔ جو قصیدہ کے لیے ضروری ہیں۔ اور اُن کے بعد قصیدہ گوئی میں ذوقؔ و غالبؔ و مومنؔ وغیرہم کی باری آتی ہی۔ ذوق بے شک ایک فاضل شاعر تھے۔ اُردو کا پاکیزہ روزمرہ دہلی میں یا تو میرؔ نے کہا یا پھر اُن کے بعد ذوقؔ نے۔ مگر میں اُن کو سوداؔ کے سامنے کامل قصیدہ گو کہنے کو تیار نہیں حالانکہ اُن کا پورا مجموعۂ قصائد موجود ہی۔ جس میں جزالت الفاظ و تراکیب چستی بندش بلندی خیال سب کچھ پائے جاتے ہیں۔ لیکن پھر بھی جن حضرات کی نظر سے فارسی کے چست قصیدہ گو مثلاً خاقانی۔ انوری۔ ظہیر فاریابی۔ عرفی۔ قاآنی وغیرہم کا کلام گذرا ہو اور بشرطیکہ وہ مذاق سلیم اور نظر وسیع بھی رکھتے ہوں۔ اُن کے سامنے ذوق علیہ الرحمہ کے جزیل قصیدے۔ شان الفاظ یا مجموعۂ الفاظ و تراکیب کہے جانے کے سوا اور کچھ وزن نہیں رکھتے۔ پڑھنے والے کا دماغ جزالت الفاظ کے دباؤ میں بجائے

اور اُس کو بلندی خیالات۔ یا خوبی نظم کی دلچسپیوں سے مایوسی ہو جاتی ہی۔ ان کی غزل میں غزل کا مزہ آتا ہی۔ مگر اُن کے قصائد میں قصائد کا لطف کافی نہیں ملتا +

رہے غالب وہ اُردو کے قصائد ہی میں نہیں۔ بلکہ غزل میں بھی اکثر فارسی کے چست گو شاعر عرفی و ظہیری کی بلند خیالیوں کا اتباع کرتے ہیں۔ اُن کے فارسی کلام کا کیا ذکر۔ اس لیے اُن کے مختصر اُردو کے قصائد میں پڑھنے والے کو فارسی کے قصیدہ گویوں کی جھلک نظر آتی ہی۔ یہ حیثیتِ خیال اُردو کا وہی قصیدہ۔ قصیدہ ہی جس کو پڑھ کے کم از کم فارسی کے قصائد کا لطف آجائے۔ ورنہ نظمِ سخن کے لیے تو بڑی گنجائش ہی +

غزل گو اُردو زبان پر احسان کرتا ہی۔ برخلاف اس کے اُردو کا ایک اچھا قصیدہ گو علوم مشرقیہ کے وقار کو قائم رکھتا ہی۔ اُن کی قوت دکھاتا ہی سلاست تراکیب کی خوبیوں کے علاوہ بلندی فکر کے جواہر پیش کرتا ہی۔ غالب نے زبان اُردو پر احسان نہیں کیا بلکہ تخیلِ شعر پر احسان کیا۔ ذوق نے فقط فکر قصیدہ سے علوم مشرقیہ کے وقار کو قائم رکھا۔ مگر اپنی غزل گوئی سے زبان اُردو کی پرورش کی۔

صحبت قصیدہ خوانی اور رشید

جناب رشید نے عموماً قصائد نہیں کہے۔ اور نہ اُن کو ضرورت تھی۔ اگر کسی رئیس کی تعریف مقصود ہوتی تھی۔ تو اُس کے لیے رباعی کے چار مصرعے کافی تھے۔ وہ مدّاح امام تھے۔ مداح عوام نہ تھے۔ مگر سال میں ایک قصیدہ ضرور کہتے تھے۔ اور عریضہ کے ساتھ پندرہ شعبان المعظم کو (جو ولادت آخر الزماں کی صبح ہی) دریا میں ڈال دیتے تھے۔ اور اُس کے بعد اُسی وقت اپنے مکان ہی پر پڑھا کرتے تھے۔ ایک معقول مجمع ہو جاتا تھا۔ لیکن پھر بھی بہت سے مشتاق کلام نہیں پہنچ سکتے تھے۔ کیونکہ وقت بہت نازک ہوتا تھا۔ اس وجہ سے جناب مولانا سید محمد حسین صاحب قبلہ جنت مآب مغفور

دوسرے یا تیسرے روز اپنے مکان پر ۸ بجے صبح کو ایک محفل مقرر قرار دیتے اور رشید وہی نیا قصیدہ دوبارہ پڑھتے تھے۔ ہمیشہ یہ ہوتا تھا کہ کثرت سامعین کی وجہ سے مغفور کے وسیع مکان میں گنجائش باقی نہ رہتی تھی۔ اور لوگ دروازہ کے باہر تک کھچا کھچ بھرے ہوتے تھے۔ رشید نے سوائے خاندان رسالت کے کسی دوسرے کو اپنا ممدوح نہیں بنایا۔ اس لیے صرف مدح ائمہ میں قصائد ملے اس کے سوا کچھ نہیں +

یہ قصیدے نہایت سلیس اردو زبان میں ہیں۔ غزل کے شوخ مضامین سے کوئی شعر خالی نہیں۔ اُن کے قصائد میں بیشتر وہ شان نہیں پائی جاتی جو محققین سخن نے قصائد کی تعریف میں ناگزیر لکھی ہے۔ خلاصہ یہ کہ رشید کے قصیدے بھی زبان اردو اور محاورات انیس کے عمدہ نمونے ہیں۔ ذیل میں رشید کے چند قصیدوں کا اختصار درج ہے۔

انتخاب قصائد

در مدح امام دوازدہم علیہ السلام

رہیں ہم بحرِ عالم میں نہیں یہ بات امکاں میں	ٹھہر سکتے نہیں ہیں آکے آنسو چشمِ گریاں میں
کبھی کنگھی جو کرتے آپ کی زلفِ پریشاں میں	پریشانی نہ ہوتی حضرتِ یوسف کو زنداں میں
نہیں جو آپ کا قائل وہ مذہب کچھ نہیں رکھتا	معین ہو گئے ہیں رکنِ آخر آپ ایماں میں
خدا نے ابتدا اور انتہا کا درمیاں رکھا ہے	رسول اللہ کا ہے اور تمہارا نام قرآں میں
نبی فرماتے ہیں جب دیکھتے ہیں اس چمن اپنا	ابھی اک پھول اور آئے گا جنت کے گلستاں میں
تصور میں قریبِ حضرت کے یوں انصار بیٹھے ہیں	تعلق جس طرح سے ہے دہن میں دنداں میں
اگر نازِ غضب تیری اجازت لیلے رحمت سے	ہمیشہ ابرِ تر سے آگ برسے فصلِ باراں میں

خوشی یہ آپ کے آنے کی ہے سارے زمانہ کو
کہ اب تو لوگ باتیں کرتے ہیں شہر خوشاں میں

بھلا یہ کون کہتا ہے کہ محتاجی کا عالم تھا
گھر تم سے بھرے تھے حیدر صفدر کے داماں میں

کیا ہے تم نے مداحوں کا سلطاں پاس بلوالو
قیامت ہے کہ میری قبر ہو گور غریباں میں

رشید آقا سے کہہ وہ ناخدا ہیں بحر عالم میں
بہت جلدی خبر لیجے مری کشتی ہے طوفاں میں

ایضاً

آؤ گے جب تم تو بالکل فیصلا ہو جائے گا
کفر سے دیں اک اشارہ میں جدا ہو جائے گا

آئے گا آپ جب عالم نیا ہو جائے گا
پاؤں کی آواز سے محشر بپا ہو جائے گا

کچھ ہمیں پروا نہیں ہے گر چھپا لے گا فلک
ماہِ نو تیرا گریبانِ قبا ہو جائے گا

ہونگے پھولوں سے زیادہ آپکے نقشِ قدم
گلشنِ جنت درِ دولت سرا ہو جائے گا

آپ کہلا بھیجیے گا صبر کر آتا ہوں میں
ایک دن ایسا مرا نالہ رسا ہو جائے گا

گر کہوں گا آپ میری التجا سنتے نہیں
اے معاذ اللہ مولا یہ گلا ہو جائے گا

مصلحت ہو گی تو تم کو بھیج دے گا کبریا
آج ہو موعود کل وعدہ وفا ہو جائے گا

جب سنیں گے صور اٹھ کر قبر سے دوڑیں گے ہم
شور محشر تیرے گھوڑے کی صدا ہو جائے گا

کرب میں ہے اور بلا میں بھیجیے جلدی خبر
ورنہ آخر نام دل کا کربلا ہو جائے گا

جلد تر پہونچانے کو میرا عریضہ آپ تک
تیز بہتے بہتے سب دریا ہوا ہو جائے گا

سوئے شہ جانے کو ہیں سب ضعف سے کہتا ہوں میں
مجھ کو اٹھنے دے روانہ قافلا ہو جائے گا

آؤ گے جب تم تو دشمن مر گئے میں ہونگا شاد
وہ برا مانیں گے اور میرا بھلا ہو جائے گا

کفر سب عالم میں پھیلے جلد کہتا ہوں رشید
جانتا ہوں اس سے میرا مدعا ہو جائے گا

رباعیات و سلام رباعی جس قدر صاف اور نصیحت آمیز کلام سے مالامال ہو اُسی قدر اُس کی عمدگی ہے۔ خصوصاً چوتھے مصرعہ کو اس طرح صاف اور بے تکلف ہونا چاہیے کہ پڑھنے والے کے دل پر وہ مضمون اثر کر جائے جس کے لیے چار مصرعے کہے گئے ہوں۔ کیونکہ باقی تین مصرعے فقط چوتھے کے خیال کو پورا کرنے میں مُمد ہوتے ہیں۔

شعرائے اُردو اور رباعی۔ جہاں تک دیکھا جاتا ہے اُردو شاعروں میں رباعی کے حق میں کوئی اتنا کامیاب نظر نہیں آتا جتنا مرثیہ گو حضرات۔ ظاہر وجہ یہ ہے کہ علاوہ مرثیہ گویوں کے دوسرے شاعروں نے رباعیات صرف تفنن طبع کی غرض سے کہیں کہ اُنھیں اس صنفِ سخن میں زمانہ معذور نہ سمجھے ورنہ رباعی کا مصرف اُن کے لیے مفقود ہے۔ ہر مشہور شاعر غزل گو نے رباعیاں کہیں مگر بہت کم۔

لیکن خلیق۔ انیس۔ مونس۔ دبیر۔ عشق۔ تعشق۔ نفیس۔ رشید۔ عارف۔ اوج۔ یا اور دوسرے مرثیہ گویوں کے کلام میں رباعیات کا بھی کافی ذخیرہ ملتا ہے۔ یہ کیوں۔ یہ اس وجہ سے کہ مرثیہ گو جب نیا مرثیہ پڑھنے ممبر پر بیٹھتا ہے تو اُس کو ضرورت ہوتی ہے کہ سامعین کو مضامین مرثیہ سُننے کے لیے پہلے آمادہ کرلے۔ اور اُس کے بعد مرثیہ شروع کرے۔ کیونکہ اگر فوراً ہی بغیر رباعیات و سلام مرثیہ شروع کر دیا جائے تو سامعین کو متوجہ ہوتے ہوتے بہت سے اُن مصرعوں کا خون ہو جائے جو شاعر نے خونِ جگر صرف کر کے کہے ہیں۔ میری غرض یہ ہے کہ رباعیات و سلام مرثیہ کے لیے وہی کام دیتے ہیں جیسے ایک عمدہ نثر کا تمہیدی حصہ۔ جو پڑھنے والے کو آنے والے مضامین کی اجمالاً خبر دیتا ہے اور اُس کے اشتیاق کو بڑھا دیتا ہے۔ رشید نے بہت رباعیاں کہیں۔ مگر اُن سب میں مضامین پیری کے متعلق جتنی ہیں اُتنی کسی دوسرے مضامین کی نہیں پائی جاتیں۔ ذیل میں رباعیات و سلام کا انتخاب درج ہے۔

انتخاب رباعیات متعلق پیری

پیری و بیچارگی	دل کو سو طرح کے غم کھلتے دو جانے کا جوانی کے ہی غصہ بیکار	پیری جو رشید آئی ہی آنے دو دیکھو اپنی طرف بس اب جانے دو
آرام لحد اور عشرت جہاں میں خوبی نگاہ	پیری سے ہیں خم راہِ جہاں کیونکر لیں لیٹے ہیں لحد میں اے فرشتو نہ ستاؤ	اک عمر پھرے ہیں دم ذرا دم بھر لیں چلتے ہیں ذرا کمر تو سیدھی کر لیں
جوانی کا غم	مدت سے جوانی کا الم باقی ہی یوں جھک کے جوانی سے ملا وقتِ وداع	اک عمر سے یہ نشانِ غم باقی ہی جب سے اب تک کمر میں خم باقی ہی
فلک شکایت	پیری میں خمیدہ کر دیا ہی تو نے سیدھا ہونے دے اب تو اے پیرِ فلک	ظالم کیسا ستم کیا ہی تو نے اپنا سا مجھے بنا لیا ہی تو نے
پیری اور ضعف	پیری نے جوانی کی جو دولت لے لی لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللہ	گویا مرے قتل کی اجازت لے لی ظالم نے توانائی و طاقت لے لی
اُمید جنت	نامی ہوئے بے نشان ہونے کے لیے کی ہوس قبول خواہشِ جنت میں	افسانہ ہوئے بیان ہونے کے لیے ہم پیر ہوئے جوان ہونے کے لیے
خمیدگی کمر اور حسن تعلیل	آخر ہوں دمِ فراق پاتا ہوں میں پیری سے نہیں ہوں خم سفر ہی نزدیک	ہستی سے عدم کی سمت جاتا ہوں میں دل بیٹھ گیا جھک کے اٹھاتا ہوں میں
پیری اور یادِ مرگ	بیتاب ہی یہ قلبِ حزیں اپنی طرف پیری میں جھکے جانے کا باعث یہ ہی	اور روح کو آرام نہیں اپنی طرف اب کھینچتی ہی ہمکو زمیں اپنی طرف

یادِ جوانی	پیری سے خاک مہربانی نہ ہوئی یوں توڑنا دم کہ دیکھنے لوگ آتے	وقتِ آخر بھی کامرانی نہ ہوئی افسوس کہ اس وقت جوانی نہ ہوئی
پیری اور زینت باطل	پیری میں رشید یہ بد آئینی ہے آئینہ بھی دیکھتے ہو ماشاءاللہ	بالوں میں خضاب طرفہ رنگینی ہے اب تک تم کو خیال خودبینی ہے
آخری وقت کی ذمہ داریاں	کیا بات ہے کس خوف سے تھراتا ہوں پیری تو جوانی سے گراں قدر نہیں	کچھ قوت و طاقت میں کمی پاتا ہوں کیا بوجھ پڑا ہے کہ جھکا جاتا ہوں
جوانی سے یاس	پیری کیا موت کی نشانی پہنچی رستہ میں بھی ملنے کی توقع نہ رہی	نزدیک اب مرگِ ناگہانی پہنچی ہم اب چلے جب دور جوانی پہنچی
پیری اور ضعفِ بصر	طفلی تو گئی دور اُسے کیا جانیں ہم پیری نے یہ حال کر دیا آنکھوں کا	پائیں یہ کہیں خاک بھی گر چھانیں ہم مل جائے جوانی تو نہ پہچانیں ہم
گناہوں سے بریت کی شاعرانہ معذرت	ہیں یاد وہ دن نظر میں وہ راتیں ہیں تربت میں گنہ اپنے بیاں کر کے رشید	سمجھوں گا۔ مرے پاس بھی کچھ گھاتیں ہیں کہدوں گا۔ جوانی کی یہ سب باتیں ہیں
پیری اور تخفیفِ تکلیف	پیری میں عبادت کی کہاں طاقت ہے پیروں پہ خدا نے کی ہے تخفیف رشید	سچ پوچھتے ہو گر تو فقط ہمت ہے دیکھو کہ نمازِ صبح دو رکعت ہے
خمیدگیٔ کمر اور افسوس	ملتے ہیں داغِ غم یہ گل چنتا ہوں ہر بار خمیدہ ہوتی جاتی ہے کمر	رعشہ پیری سے کب ہے سر دھنتا ہوں جھک جھک کے صدائے آہِ دل سنتا ہوں
علامتِ پیری	جھریاں وہ بلائیں جان پر آتی ہیں پیری کا بڑھا ہے زور کیا دیکھوں میں	یہ جھریاں پتھر میں بھی در آتی ہیں آئینہ میں جھریاں نظر آتی ہیں

پیری اور جوانی سے جدائی	پیری وہ ہے کہ جس کا مارا ہوں میں چھپ جاؤں نظر سے ہے وہ ہنگام قریب	اے بھائیو مہمان تمہارا ہوں میں وقت اور ہے اب صبح کا تارا ہوں میں
پیری اور تجربۂ دنیا	دیکھی سب سب کی مہربانی ہم نے رکھا نہ وہ دل جب میں تمہیں لاکھوں باتیں	سُن لی اک اک کی لن ترانی ہم نے طے کر دیا قصۂ جوانی ہم نے
انقلاب	ایسا بھی نہ انقلاب دیکھا ہوگا کہتا ہوں جو میں کہ تھی جوانی میری	کب میری طرح شباب دیکھا ہوگا پیری کہتی ہے خواب دیکھا ہوگا
یادِ جوانی	کیوں جا کے سوئے عالمِ فانی آتی کہتا جب میں ذرا دکھا دے صورت	مغرور اگر تھی نہ جوانی آتی اے کاش صدا سے لن ترانی آتی

سلاموں کا انتخاب

ہیں بر میں صبر گوشۂ خوشخو لیے ہوئے	جاتا ہے دل کو تیر سہ پہلو لیے ہوئے
کہتے ہیں شاہ لیتے ہیں اکبر جو کروٹیں	اُمت کی بھی نجات کا پہلو لیے ہوئے
جنسِ ثواب بکتی ہے میدانِ حشر میں	ہم بھی کھڑے ہیں ٹوٹے سے آنسو لیے ہوئے
میرے گناہ تولتی ہے رحمتِ خدا	قدسی الگ کھڑے ہیں ترازو لیے ہوئے
اُس فوج سے نہ کیوں دلِ شبیر ہو قوی	جس کا نشاں ہو قوتِ بازو لیے ہوئے
خیمہ سے لاش لے چلے اکبر کی جب حسین	ماں دور تک آئی ہاتھوں پہ گیسو لیے ہوئے
طوقِ آہن عابدِ دلگیر کا دمساز ہے	خیر مقدم خانۂ زنجیر میں آواز ہے
ایک معصومہ کی عصمت جلوہ فرما ہے جہاں	حضرت مریم کی عصمت فرش پا انداز ہے
شہ نے اتنے زخم کھائے اس میں کتنے زخم ہیں	دل کے سو ٹکڑے ہیں ہر ٹکڑے میں گداز ہے

زخم کھاتے ہی علی اصغر کرینگے انتقال ۔ تیر مرغِ روح کو گویا پیامِ پرواز ہی
مرنے جاتے ہیں علی اکبر جوانی ہی شروع ۔ عمر کا انجام ہی اور سبزہ کا آغاز ہی
جو کہوں گا تو کرے گا دمبدم کہتے تھے شاہ ۔ اے مرے مالک مجھے رحمت پہ تیری ناز ہی
یاد اصغر بھی ہی شہ کو زخم کھانے کا بھی شوق ۔ دل لیئے جاتی ہی ایسی تیر کی آواز ہی

روکتا کون اہلِ کیں کو ایک بھی یاور نہ تھا ۔ لوٹنے جب آنے تھے ظالم کوئی در پر نہ تھا
چین کیا پاتے حرم زنداں کچھ اپنا گھر نہ تھا ۔ اونچی نیچی تھی زمیں تکیہ نہ تھا بستر نہ تھا
کس سے پوچھوں طشت میں رکھا گیا کیوں زیرِ تخت ۔ زانوئے زہرا پہ جو رہتا تھا وہ سر نہ تھا
کربلا تک لے گئی تہیں پھر کے جب پہنچیں وطن ۔ ماں کے ساتھ اکبر نہ تھے اور گود میں اصغر نہ تھا
بعد قتلِ شاہِ دیں ہر ایک کا تھا دل لہو ۔ جس کے نیچے طوق نہ ہوا ایسا کوئی ہمسر نہ تھا
جنگلوں میں روز و شب پھر پھر کے کہتے تھے حرم ۔ یوں ہوئے بے گھر کبھی جیسے ہمارا گھر نہ تھا
کٹ گیا سر شہ کا ڈوبی کشتیِ آلِ رسول ۔ ناخدا بیچارہ تھا بیمار اور لنگر نہ تھا
پوچھ کے رضواں سے کیوں جاتا جناں میں اے رشید ۔ واہ وا کیا میں غلامِ حضرتِ قنبر نہ تھا

خوشی سے زخم کھانے یوں شہِ دلگیر آتے ہیں ۔ کہ بڑھ جاتا ہی دل جب سامنے سے تیر آتے ہیں
نکل آئی ہیں موجیں کوثر و تسنیم سے باہر ۔ خبر پہنچی ہی پیاسے حضرتِ شبیر آتے ہیں
لپسر کے بعد جب کرتی کمانیں شہ نے فرمایا ۔ علی اصغر گئے دنیا سے اب کیوں تیر آتے ہیں
گئے ہیں شاہِ دیں لے کر کھڑی ہیں منتظر بانو ۔ بیاں ہی دیکھیے کب اصغرِ بے شیر آتے ہیں
نہ نکلے اس سے بھی نالہ یہ ہی منظور عابد کو ۔ فقط اسواسطے تھمائے ہوئے زنجیر آتے ہیں

گرے ہیں رن میں اکبر دوڑے ہیں ہر سمت سے اعدا
مٹانے کو رسول اللہ کی تصویر آتے ہیں

کس طرح دل جانِ زہرا سے سنبھالا جائیگا
تیر کیونکر حلقِ اصغر سے نکالا جائے گا

یہ سمجھ کر لے گئے ہمراہ اصغر کو حسینؑ
قید میں بانو سے یہ بچہ نہ پالا جائے گا

روکنا اکبر کو تم زینب سے کہتے تھے حسینؑ
اذن اگر مانگا بہن مجھ سے نہ ٹالا جائے گا

جب وصیت کر کے شہ سر کے کہا سجادؑ نے
مجھ سے یہ بچوں کا گھر کیونکر سنبھالا جائے گا

کہتے تھے سب بنا تھا عابدؑ کا جب طوقِ گراں
ہائے یہ گردن میں کس بیکس کی ڈالا جائے گا

رو کے فرماتی تھیں زہراؑ کو دیکھے جو حسینؑ
میرے بچہ بے خطا تو مار ڈالا جائے گا

کہتے تھے عابدؑ مٹے تلووں کے سارے آبلے
پر قیامت تک نہ دل کا کوئی چھالا جائے گا

شور ہی حلو میں سر لیتے ہیں اصغر کا لہو
حشر آجائے گا جب یہ خوں اچھالا جائے گا

مرثیے جائیں گے ہم قبر میں بھی اے رشید
یہ ہمارے ساتھ جنت کا قبالا جائے گا

[illegible]

غدر کے بعد سے لکھنؤ وہ لکھنؤ نہیں رہا جس کی ہوائیں اہلِ کمال کا طواف کرتی تھیں اور اُن کو اپنے آغوش سے جُدا ہونے کی اجازت نہ دیتی تھیں۔ لکھنؤ کے وہ اہلِ دولت جن کے قدر شناس ہاتھوں نے کمال کی مختلف تصویروں پر زریں بچھاور یں کیں تھیں۔ آج اپنے سینوں پر خالی ہاتھ رکھے لکھنؤ کے ویران و بے نشان قبرستانوں میں آرام کر رہے ہیں۔ اور اپنی بے بسی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے گذرنے والوں کو کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ کا زبردست حکم یاد دلاتے ہیں +

لکھنؤ کا گیا گذرا زمانہ تھا۔ اور کمال کا وداعی وقت تھا۔ مگر پھر بھی آتش و ناسخ کو معتمد الدولہ بہادر نے ایک معتدبہ یکمشت رقم دیکر کہا کہ میرا اب وہ زمانہ نہیں ہے جو آپ لوگوں کی خدمت میں ماہانہ پیشکش کیا کروں۔ لہٰذا یہ رقم یکمشت قبول فرمائیے۔ ناسخ مغفور چونکہ ایک تاجر کے فرزند تھے۔ اُنھوں نے روپیہ کی قدر کی۔ اور ہرن کی سرائے میں دوکانیں اور مکانات خرید کے

اپنی آشفتہ زندگی کمال کی بدولت آرام و آسائش سے گزاری۔ بیچارے آتش مرحوم وہ ہمیشہ کے مست خیال تھے۔ کبھی دولت کی پروا کی ہوتی تو یہ روپیہ بھی رہتا۔ ایک ہی سال میں کھا کھلا کے بیٹھ رہے۔ اور پھر وہی مفلس آتش ہو گئے۔ خواجہ سعدی کے قول کو قوی کیا۔ ایک شاعر نے کہا دوسرے نے عملاً دنیا کو دکھا دیا کہ ؎

نیم نانے گر خورد مرد خدا　　　بذل درویشاں کند نیمے دگر

ترکِ وطن اور اہلِ کمال

وہ زمانہ آ گیا تھا کہ انیس ایسا مستغنی المزاج بھی ایک دفعہ لکھنؤ چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ اگرچہ ضیافت کرنے والوں نے قدر شناسی اور عزت کمال میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ مگر پھر بھی لکھنؤ کی گری ہوئی ہوا انیس کو جلد سے جلد حیدرآباد سے اپنے مرکز پر کھینچ لائی +

یہ ضرور ہے کہ اہلِ کمال کو ہوسِ زر سے مستغنی ہو جانا چاہیے۔ مگر ضرورت زمانہ کسبِ معاش۔ پرورشِ عیال۔ ترک وطن پر مجبور ہی کر دیتے ہیں۔ لکھنؤ کی خاک اب بھی اہلِ کمال کے پیدا کرنے میں قاصر نہیں۔ مگر اس دورِ ناگوار سے مجبور ہو کر اُن کی وقتی جدائی گوارا کر لیتی ہے +

رشید کا نقدِ کمال جب لکھنؤ کی کسوٹی پر ایک نمایاں رنگ دینے لگا۔ تو ہندوستان کے شیعی حلقوں میں اُن کے کلام کے سننے کا اشتیاق پیدا ہو گیا۔ اور خود رشید کے ضروریاتِ زندگی بھی کثرتِ تعلقات سے وسیع ہوتے گئے۔ پہلے جو حضرات لکھنؤ کے باہر رشید کے کلام کے مشتاق ہوئے وہ دو بزرگ نواب صفدر حسین خاں صاحب اور نواب مظفر حسین خاں صاحب شیخ پورہ حسین آباد کے تھے۔ ان حضرات کے یہاں رشید مدت تک جاتے رہے +

رشید رامپور میں

وہ وقت ہو کہ نواب مشتاق علی خاں بہادر مرحوم کا انتقال ہو چکا ہو اور جنرل اعظم الدین خاں کا دور دورہ ہو۔ موجودہ نواب عالی وقار نابالغ ہیں۔ گورنمنٹ آف انڈیا کی طرف سے جنرل مذکور انتظام ریاست کے لیے مقرر ہوئے ہیں +

نواب صفدر علی خاں صاحب مرحوم خلف نواب محمد سعید خاں بہادر۔ نواب کلب علیخاں (خلد آشیاں) کے چچا تھے۔ مذہب اثنا عشری رکھتے تھے۔ اور مجالس محرم اور تعزیہ داری کی رسم رامپور میں ادا کرتے تھے +

جب ۱۸۸۷ء میں نواب مشتاق علی خاں صاحب بہادر تخت نشین ہوئے تو اُنھوں نے اپنے اجداد کے بنا کردہ امام باڑہ کو پھر ذکر حسین سے آباد کیا جس کا سلسلہ آج تک جاری ہو۔ اُن مرحوم کے بعد بھی جناب عالیہ مغفورہ کے اثر سے ریاست کے امام باڑہ میں محرم کی مجالس برابر ہوتی رہیں۔ چنانچہ تقریباً ۱۸۹۴ء میں نواب صفدر علی خاں صاحب مرحوم کی تحریک سے جنرل مذکور نے جناب رشید کو مجالس محرم پڑھنے کے لیے طلب کیا۔ ریاست کی طرف سے جناب رشید کی بہت خاطر مدارات ہوئی۔ دونو وقت خاصہ کا کھانا اور اشیاء ضروری بھی بافراط مہیا رہتے تھے +

نواب رامپور اور جناب رشید

اُس وقت عالی جناب نواب حامد علی خاں بہادر بالقابہ بغرض تبدیل آب و ہوا یعنی تال پر رونق افروز تھے۔ صرف جناب رشید کو سُننے رامپور تشریف لائے۔ جس کا اظہار خود وقت ملاقات فرمایا۔ یعنی نواب صاحب نے جناب رشید سے فرمایا: "میں آپ کے سُننے کے لیے پہاڑ سے آیا ہوں"۔ جناب رشید نے جواب میں عرض کیا "عنایت۔ قدردانی"۔

اُس وقت یہ وسیع قلعہ نہ تھا۔ بلکہ طرز قدیم کے موافق ایک چار دیواری تھی۔ اور بڑے دروازہ پر ایک توپ لگی رہتی تھی۔ اس دروازہ کے قریب پُرانا امام باڑہ تھا جس کا نشان

اب نہیں پایا جاتا۔ صرف چند گذشتہ والیان ریاست کی قبریں جالی دار چوکھٹے میں ڈھکی نظر آتی ہیں + نواب حامد علی خاں صاحب بہادر نے کھی بھون کے جانب جنوب ایک خوشنما امام باڑہ معہ ایک مختصر مسجد کے تعمیر کرایا ہی۔ اس میں معہ شاہ نشین تین درجے ہیں۔ سب سے آخر یعنی شاہ نشین پر چاندی کی ایک بڑی اور خوشنما ضریح رکھی ہی اور اس پر سبز مخمل کا کارچوبی شامیانہ نصب ہی۔ ماہِ محرم میں اس ضریح کے دونوں طرف دوسری ضریحیں اور علم رکھے جاتے ہیں۔ بیچ کے درجہ میں ایک بڑا چاندی کا ممبر ہی اسی درجہ میں شاہ نشین کے متصل نواب صاحب سیاہ مسند پر ماہِ محرم میں تشریف فرما ہو کر شریک مجلس ہوتے ہیں +

امام باڑہ کے آگے ایک وسیع چبوترہ ہی جس کا مغرب و جنوب مسجد کے صحن سے ملتا ہی +

الغرض جناب رشید نے مجالس پڑھنا شروع کیں۔ پہلی مجلس میں یہ مرثیہ پڑھا۔

دفنِ علی اصغر سے جو فرصت ہوئی شہ کو

چھ سات سو آدمیوں کا مجمع ہوتا تھا۔ جس میں بیشتر اراکینِ ریاست ہوتے تھے +

نواب صاحب کی سخن سنجی	جنابِ رشید نواب صاحب کی نکتہ رس طبیعت کی تعریف فرماتے تھے اور تعجباً کہتے تھے کہ سرکار ایسی برمحل داد دیتے تھے کہ مجھ کو حیرت ہوتی تھی +

ایک روز جناب رشید مرثیہ پڑھ رہے تھے۔ اثنا خواندگی میں۔ نواب صاحب نے فرمایا "آپ کو ہمیشہ تکلیف کرنی ہوگی" جناب رشید نے عرض کی "حضور دیکھا جائے گا" نواب صاحب نے پھر فرمایا "نہیں نہیں وعدہ کیجیے" ابکی جنابِ رشید کے الفاظ تھے "حضور جیسا حکم ہوگا" سہ بارہ نواب صاحب نے فرمایا "آپ وعدہ کیجیے" جنابِ رشید نے عرض کی "بہت خوب"

عطائے خلعت

چنانچہ حسب وعدہ جناب رشید ہر سال تشریف لیجایا کیے۔ نواب صاحب کے بااختیار ہونے پر بھی دو سال تشریف لے گئے ہیں پہلے سال جب برائے حصول رخصت جناب رشید کچی بھون میں تشریف لے گئے تو نواب صاحب نہر میں حمام کر رہے تھے اطلاع ہوئی بلا لیا۔ باتیں کرتے رہے۔ اور جب حمام سے فارغ ہوئے دربار میں تشریف لائے اور حکم دیا۔ کہ ایک خلعت مع شالی رومال جناب رشید کو عطا ہو + عطائے خلعت رشید کے لیے مخصوص تھی۔ ورنہ رامپور میں خلعت دینے کا رواج نہ تھا۔ نہ ہی جناب رشید کو ہر سال تین سو پچیس روپیہ سالانہ ملتے تھے۔ ایک سال نواب صاحب کو رشید کا کلام بہت پسند آیا۔ وقتِ ملاقات جوشِ مرحمت میں فرمایا "جب میں بااختیار ہونگا تو بہت کچھ دونگا"
ایک سال ریاست سے طلب کا تار نہ آیا لہذا پھر نہ گئے +

رشید عظیم آباد میں

عظیم آباد میں شیعوں کی بیشتر تعداد انیس کے ماننے والوں کی ہے۔ اور خود انیس مرحوم نے وہاں بڑے بڑے معرکہ کی مجالس پڑھی ہیں۔ دبیر کے شیدائی بھی ہیں مگر مقابلتاً کم + یہ ابتدا ہی سے مشہور تھا کہ رشید اپنے نانا انیس کی زبان کہتے ہیں۔ لہذا وہاں کے لوگوں میں جیسا اشتیاق پیدا ہو سکتا ہے ظاہر ہے + اس بنا پر رؤسائے شہر سے لوگوں نے خواہشیں کرنی شروع کیں کہ جنابِ رشید بلائے جائیں۔ چنانچہ جناب چھوٹے نواب صاحب برادرِ خرد جناب پادشاہ نواب صاحب نے اپنے ملازمین مع خطوطِ طلب روانہ کیے۔ مگر جنابِ رشید نے انکار کیا۔ بالآخر شاید ۱۳۲۲ھ میں رشید کے ایک دوست جناب بین صاحب رشید کو لے گئے اور اپنے یہاں ایک مجلس پڑھوائی بعدِ ختم مجلس نواب صاحب مذکور نے بذریعہ رفقا رشید سے وعدۂ مجلس لینا چاہا انھوں نے فرمایا "انشاء اللہ" نواب صاحب کو اس جملۂ شرطیہ انشائیہ سے اطمینان نہ ہوا

اور وقت پر خود جناب بتن صاحب کو منتخب کیا کہ لکھنؤ جاکے جناب رشید کو لائیں چنانچہ اس سال بتن صاحب لکھنؤ آئے اور جناب رشید کو با صرار لے گئے۔ باؤنی کے امام باڑہ میں مجالس ہوئیں۔ یہ وہی امام باڑہ ہے جس میں انیس کے آیات کمال کا اظہار ہو چکا ہے۔ میر نواب صاحب مونس۔ و میر بادی صاحب وحید جس میں برسوں پڑھے ہیں۔ رشید کے لیے اس ممبر پر پڑھنا باعث فخر تھا۔ جو ان کے جد کامل انیس کا قدم آشنا تھا۔

جب رشید پہنچے مجلس منعقد ہوئی۔ سارا عظیم آباد جمع ہوگیا۔ خود فرماتے تھے کہ تقریباً ڈیڑھ ہزار آدمیوں کا مجمع ہوتا تھا۔ جن میں اہل ہنود پانسو سے کم تعداد میں ہوتے تھے۔ رشید وہاں ایک عشرہ پڑھتے تھے۔ دو بجے مجلس شروع ہوتی تھی اور چار بجے ختم ہوتی تھی۔ سامعین اس قدر محظوظ ہوتے تھے۔ کہ مرثیہ کہیں سے چھوڑنے نہیں دیتے تھے۔ بعد مجالس نواب صاحب ساڑھے سات سو روپیہ دیتے تھے۔ اور بہت اعزاز و اکرام فرماتے تھے۔ رشید نے انتقال کے دو سال قبل عظیم آباد جانا خود ترک کر دیا تھا۔ وجہ عذر پیری۔

رشید حیدرآباد میں

عالی جناب نواب بہرام الدولہ بہادر کے یہاں حیدرآباد میں بڑی بڑی نامی مجلسیں ہوتی تھیں اور ہوتی ہیں۔ ہزاروں آدمی جمع ہوتے ہیں۔ لکھنؤ کے نامی اکثر بیشتر یہیں آئے اور آتے ہیں نفیس مرحوم کے بعد جناب عارف مرحوم نے اپنے کامل نانا کی جگہ لی۔ اور ہر سال جانے لگے۔ وہاں کے نکتہ رس حضرات نے جناب نواب مذکور سے جناب رشید کے سننے کا شوق ظاہر کیا۔ لہذا تحریک طلب کی گئی۔ مگر تحریری جس کا کوئی نتیجہ نہوا۔ دو سال برابر جناب رشید کے نام تار آیا۔ مگر انھوں نے باوجود تنگی معاش

وہاں جانے سے انکار کیا۔ اسی سلسلہ میں ایک روز جناب مولانا سیّد محمد حسین صاحب قبلہ مغفور نے مؤلف سے ایک روز فرمایا۔ کہ جناب رشید سے اور مجھ سے جو دوستانہ تعلقات ہیں اُن کو کوئی دوسرا سمجھ ہی نہیں سکتا۔ ہر امر میں مجھ سے مشورہ کرتے ہیں۔ دُنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے مگر میرا کہا نہیں ٹالتے مگر ایک موقع پر مجھ کو بڑا تعجب ہوا۔ جبکہ جناب رشید کے پاس دوسرا طلبی کا تار آیا تھا۔ وہ تار لیے ہوئے فوراً میرے پاس آئے اور مجھ سے استشارہ کیا۔ میں نے اُن کے اخراجات کی زیادتی اور ذرائع آمدنی کی کمی پر نظر کرتے ہوئے مشورہ دیا کہ فوراً چلے جائیے۔ جناب رشید سے اور مجھ سے اس پر ایک طویل گفتگو ہوئی۔ وہ کہتے تھے اگر میں وہاں گیا تو ممکن ہے کہ کچھ خاندانی رنجشوں کا باعث ہو۔ میں کہتا تھا کہ آپ کو صاحب مجلس خود باصرار بلا رہے ہیں۔ کسی کو شکایت کی گنجائش ہی نہیں۔ خلاصہ یہ کہ نہ جانا تھا نہ گئے۔

دوسروں کے جذبات کا لحاظ

جناب رشید چونکہ مرنجاں و مرنج مزاج کے بزرگ تھے۔ اُن کو خیال آیا کہ اگر میں نواب بہرام الدولہ کے یہاں جانے لگا تو بہت ممکن ہے کہ وہ دوسرے ذاکرین میں سے کسی کی کمی کریں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ جناب علی محمد صاحب عارف ہی ہوں۔ بے شک یہی مصلحت تھی اور کچھ نہ تھا۔ ورنہ رشید کے بیچ وہ وقت آزمائش تھا۔ روزانہ قرضدار ہوتے چلے جاتے تھے۔ وہ اعزا سے اوّل تو بہت کم ملتے تھے۔ اور اگر ملتے بھی تھے تو ہمیشہ یہ خیال رہتا تھا۔ کہ کوئی بات ایسی نہ ہو جائے جس سے باہم دلوں میں کسی قسم کا رنج پیدا ہو جائے۔ سچ ہے کہ اپنی زندگی کی آخری ساعت تک اُنھوں نے اس امر کو ملحوظ رکھا۔

سفر حیدرآباد اور جناب رشید

بہرحال جب نواب مذکور کی متواتر تین سال کی طلب پر بھی رشید نہ گئے تو اُن کے معتمد میر یاد شاہ علی صاحب ضیا مرحوم نے عرض کی۔ حضور وہ اس طرح

بلانے سے کبھی نہ آئیں گے جب تک میں اُن کے لیے خاص کوشش نہ کرونگا۔ چنانچہ
میر صاحب موصوف سے اور حکیم میر باقر حسین صاحب مغفور سے جو لکھنؤ کے ممتاز اطبا
میں سے تھے۔ باہم دوستانہ مراسم تھے۔ لہذا اُنھوں نے حکیم صاحب کے پاس خط
بھیجا اور اُن سے سفارش چاہی کہ وہ جنابِ رشید کے پاس بذاتِ خود جائیں اور
اُن کو سفر حیدرآباد کے لیے مجبور کریں۔ حکیم صاحب چونکہ جنابِ رشید کے ساتھ کے
پڑھے ہوئے تھے اور بے تکلف دوست تھے۔ اس لیے بادشاہ علی صاحب کی تحریر کے
مطابق فوراً رکاب گنج تشریف لائے اور جنابِ رشید سے کہا۔ دیکھو بھائی میں
تمہارے پاس آیا ہوں اب تمکو حیدرآباد ضرور جانا ہوگا۔ اگر اب انکار کروگے تو میرے
رنج کا باعث ہوگا۔ جناب مولوی محمد حسین صاحب قبلہ بھی تشریف رکھتے تھے۔ اُن کی مزید
تائید نے جنابِ رشید کے لیے انکار کی گنجائش نہ رکھی۔ صرف استخارہ پر بنا ٹھیری۔
اور جناب مولانا کی مقدس تسبیح کے ذریعہ سے مصلحت خدا نے بھی موافقت کی۔ دوسرے
روز حکیم صاحب نے میر بادشاہ علی صاحب کو لکھدیا کہ رشید تشریف لائیں گے
طلب کا تار اور مصارف سفر بھیجدیجیے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ تار اور دو سو روپیہ آئے
جنابِ رشید لکھنؤ سے حیدرآباد پہنچے۔ اسٹیشن پر نواب بہرام الدولہ بہادر کے
فرزند ارجمند نواب زین العابدین صاحب بہادر۔ اور میر بادشاہ علی صاحب مع چند
دوسرے رفقا کے موجود تھے۔ جنابِ رشید ریل سے اُترے۔ نواب صاحب کے
صاحبزادہ نے استقبال کیا۔ اور اسٹیشن کے باہر فٹن تک ساتھ ساتھ تشریف لاکے سوار کرادیا
جنابِ رشید فٹن میں سوار ہوکر بارہ دری سالار جنگ بہادر واقع لکڑکوٹ
باغ میں پہنچے۔ جہاں اُن کے لیے سامان آسائش فراہم کردیا گیا تھا۔ اسی بارہ دری میں

جنابِ نفیس مغفور بھی فروکش ہوتے تھے۔

جنابِ رشید فرماتے تھے کہ کھانا بہت نفیس آتا تھا۔ جس میں یہ چیزیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اور جن کی لطافت طعم کا اکثر ذکر کرتے تھے۔

چگر۔ املی کی نئی کوپل اور قیمہ۔

گبلتی۔ دہی چاول (حیدرآباد میں برائے فاقہ شکنی محرم میں استعمال ہوتی ہے)

پوڑن پوڑی۔ نہایت لذیذ مزہ میں مثل جوزی حلوا سوہن کے۔

دھی پکہار املوا۔

باقلہ کی لوز۔ میوے کی مٹھائی۔

پہلی مرتبہ جنابِ رشید محرم میں تشریف لے گئے تھے۔ اور دوسرے سال سے چہلم کے زمانہ میں جایا کرتے تھے۔ اُن کے کمال نے پہلے ہی سال ثابت کر دیا۔ کہ نفیس کے بعد اگر کسی کو حیدرآباد میں مقبولیت دائم ہو سکتی ہے تو رشید کو۔

نواب صاحب کی قدرشناسی

عالی جناب نواب بہرام الدولہ بہادر نے بھی قدر کمال کماحقہٗ کی۔ اور اب دوسرے سال جو جنابِ رشید تشریف لے گئے تو بجائے لنگر کوٹھی باغ کے نواب صاحب کی خاص کوٹھی واقع نظام باغ میں قیام کا بندوبست کیا گیا۔

رشید ہمیشہ نواب صاحب موصوف کی مدح سرائی میں رطب اللسان رہتے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ میری عزت افزائی اور قدر سخن جیسی فرمائی ہے۔ میں اس کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ واقعی اُنھوں نے اپنے احسانات کو رشید کی زندگی ہی تک محدود نہ رکھا بلکہ اُن کے بعد بھی اُن کے پسماندوں کے کفیل ہوئے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ

ذکر کمائے مجلس اور مقبولیت رشید

بقول رشید پہلی مجلس میں تقریباً سات ہزار آدمیوں کا اندازہ کیا گیا تھا

اور اُس کے بعد ہر مجلس میں پانچ ہزار سے کسی طرح کم نہوتے تھے۔ یہ مجمع اگرچہ بادی النظر میں مبالغہ کی حد تک پہنچا ہی۔ مگر حیدرآباد سے شہر اور رشید سے ذاکر کے لیے چنداں زیادہ نہیں۔ دوسرے یہ کہ رشید کا رنگِ سخن اپنے نانا انیس کے اتباع میں صاف اور عام فہم ہی، جائے تعجب نہیں اگر رشید کے کلام کو مقبولیتِ عام حاصل ہوئی +

سرسالار جنگ بہادر مرحوم کا بنگلہ وہ ایک نہایت وسیع مکان ہی جو شادی خانہ کے نام سے موسوم ہی۔ اُس میں جو مجالس ہوا کرتی تھیں کسی دوسری جگہ اتنا وسیع مجمع نہیں آسکتا تھا۔ علاوہ دیگر معززین شہر اور اراکین سلطنت کے حضرات ذیل کی شرکت قابل ذکر و باعث فخر مجلس تھی۔ عماد السلطنت نواب لائق علی خاں بہادر، منیر الملک نواب سید سخاوت علی خاں بہادر، نواب خانخاناں بہادر، نواب فخر الملک بہادر، مہاراجہ کشن پرشاد۔ شاد وزیر اعظم، نواب تہور جنگ بہادر، نواب محبوب یار جنگ بہادر، جناب مولوی افضل حسین صاحب جج جسٹس،

مجلس پیش حضور نظام کی شرکت۔ جناب مرزا محمد جعفر صاحب اوج خلف جناب مرزا دبیر اعلی اللہ مقامہ جناب فیاض علی خاں صاحب بہادر کے یہاں مجالس پڑھتے تھے۔ غالباً ۱۳۲۲ھ میں حضور نظام سیر و مجلس میں تشریف لائے۔ اور جناب اوج مغفور کو سُنا۔ بعد ختم مجلس دریافت فرمایا "کوئی اور مرثیہ خواں ہیں" حاشیہ نشینان مسند شاہی نے دست بستہ عرض کی "ظل اللہ۔ انیس مغفور کے نواسے جناب پیارے صاحب رشید ... الدولہ کے یہاں مجالس پڑھتے ہیں" نواب ... الدولہ بہادر کو شرکت مجلس کے لیے عرض کرنے کا اتفاق سے ایک بیش بہا موقع مل گیا۔ انھوں نے حضور شاہی میں عرضداشت کی کہ جناب رشید میرے یہاں مجالس پڑھتے ہیں۔ شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را۔ حکم ہوا کہ ابدولت رونق افروز مجلس ہونگے +

بنا بریں دوسرے سال حضور نظام حسبِ وعدہ تشریف لائے اور مجلسِ حسینؑ کو زینت بخشی +

شانِ امامت
شوکتِ دنیوی

یہ اُس حسینؑ غریب کی مجلسِ عزا ہے جس میں شاہانِ اولوالعزم نے بارہا اپنی شان وشوکتِ ظاہری کو تھوڑی دیر کے لیے طاقِ نسیان کی نذر کر دیا ہے۔ اُس کربلا کے مسافر کی مصیبت کوئی معمولی مصیبت نہ تھی۔ گدا و بادشاہ دونوں کے جذباتِ الم اس واقعۂ جاں گزا کے ذکر سے یکساں حرکت میں آتے ہیں۔ اور آخر کو منوا لیتے ہیں کہ اُس قبلۂ دین و اُمم کے محبوب شہزادہ نے اپنے بشیر و نذیر نانا کی اُمت کی مغفرت کے لیے دُنیا کی بڑی سے بڑی مصیبت کا سامنا نہایت خندہ پیشانی سے کیا۔ کیا اُس کے عوض میں مذہبِ اسلام کے ذی وقار نفوس اتنا بھی نہ کرتے کہ اپنی دُنیاوی نگاہ میں آدابِ امامت کو ملحوظ رکھ کے تھوڑی دیر کے لیے اظہارِ عزت و احتشام کو ملتوی رکھتے اور رسول اللہ کو خوش کرتے +

حضور نظام بصد
خلوص شرکتِ مجالس

حضور نظام کو اگرچہ مذہبِ تشیع سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مگر جانتے تھے کہ یہ مجالس رسول اللہ کے نواسہ کا غم یاد دلانے کے لیے برپا کی جاتی ہیں۔ جن میں شرکت کا ادب بھی ایک وقیع اجر رکھتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ حضورِ عالی جب نواب فیاض علی خاں بہادر کے یہاں مجلس میں تشریف لائے تھے۔ تو مسند تکیہ ہٹوا دیا تھا۔ اور اُسی فرش پر تشریف فرما ہوئے تھے جس پر عوام بیٹھے تھے +

٭ نواب بہرام الدولہ بہادر کے یہاں بھی حضورِ عالی کے لیے مسند تکیہ نہیں بچھایا گیا +

حضور نظام منبر سے کچھ فاصلہ پر دوزانو تشریف فرما ہوئے۔ زیادہ قابلِ ذکر یہ امر ہے کہ باوجود ایسی شدید گرمی کے کہ پسینہ میں تر بتر ہو گئے تھے۔ اپنے پنکھے کو رکوا دیا۔ اور دوسرے شرکاء مجلس کو برابر پنکھا جھلا گیا۔

جنابِ رشید کو بھی اپنا کلام پیشکش سمع ہمایوں کرنے کا یہ پہلا موقعہ تھا۔

آداب شاہی بجا لاکر ممبر پر تشریف لے گئے۔ اور یہ رباعیاں پڑھیں +

توصیف حیدرآباد	ماشاءاللہ ہے بہت خوب آباد		خوش وضع آباد ہے خوش اسلوب آباد	
	حضرت کے قدم سے پائی ہے یہ صورت		حیدرآباد اب ہے محبوب آباد	
	طالع جو بلندی پہ جالے آئے		مہتاب کے ساتھ ماہ پارے آئے	
	ہیں جلوہ فگن شاہ بھی شہزادے بھی		خورشید کے ہمراہ ستارے آئے	

تیسرے مصرعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور عثمان علی خاں بالقابہ بھی بزمانہ ولیعہدی اپنے والد ماجد کے ہمراہ تشریف لائے تھے + اس رباعی کے بعد ایک سلام پڑھا۔ اور مرثیہ شروع کر دیا۔ مگر یہ لحاظ رکھا کہ طول سخن حضور کی خاطر نازک پر بار نہو۔ جا بجا عرض کرتے تھے "حضور بس"۔ مگر حضور فرماتے رہے "اور پڑھیے" بشرے سے معلوم ہوتا تھا کہ رشید کا کلام جادو کا اثر کر رہا ہے۔ اور کیوں نہ اثر کرتا۔ حضور نظام خود روزمرہ لکھتے تھے۔ دوسرے نواب مرزا خاں داغ مغفور کے کلام کو خلعت حسن قبول عطا فرماچکے تھے۔ جو دہلی کے روزمرہ کی جان تھا۔ یہاں بھی مرثیہ کی یہی کیفیت تھی۔ کہ گویا گلزار لکھنؤ کا ایک بلبل چہک رہا تھا۔ نہ کہیں الفاظ ثقیل نہ کہیں مطالب دقیق۔ بندش سادہ۔ الفاظ نرم و مناسب محل۔ یہی سب باتیں تھیں جو حضور نظام کی شاہانہ آواز کو داد سخن کے پیہم بار بار بلند کرا دیتی تھیں۔ اور یہ میدان مرثیہ گوئی کا کہنہ مشق وشیر بزبان پر جھک جھک کر آداب بجا لاتا تھا +

مرثیہ اپنی پوری روانی دکھا رہا تھا ذاکر کا دل ہاتھوں بڑھا رہا تھا۔ حتیٰ کہ تقریباً دو گھنٹہ کی شرکت کے بعد حضور نظام رشید کو خلعت تحسین آخری دے کر دولت سرا تشریف لے گئے۔ اور اسی سال صرف ایک ہی مجلس میں شریک ہوئے۔ مگر دوسرے سال پانچ مجلسوں میں شرکت فرمائی۔ حضور نظام کی شرکت کی وجہ سے مجلس میں مجمع کی

کوئی انتہا نہ ہوتی تھی +

> حضور نظام اپنا کلام رشید کو پڑھنے کے لیے عنایت فرماتے ہیں۔

۱۳۲۲ھ میں حضور نے کسی مجلس میں شرکت نہیں فرمائی۔ ۱۳۲۴ھ میں چودہ مجلسوں میں تشریف لائے۔ اپنی بہت سی رباعیاں اور چودہ سلام رشید کو مرحمت فرمائیں اور ارشاد ہوا کہ آپ ایک یا دو رباعیاں اور ایک سلام روزانہ پہلے ممبر پر پڑھیے اور اُس کے بعد مرثیہ شروع کیجیے۔ چنانچہ جناب رشید نے مطابق حکم عالی عمل کیا +

(مندرجہ رباعیاں اور سلام جناب رشید نے ایک مجلس میں پڑھے تھے نقل کی گئیں)

پہلے روز جب جناب رشید کو یہ رباعیاں اور سلام مرحمت ہوئے تھے۔ تو اُنھوں نے پہلے اپنی یہ رباعی پڑھ کے اُس کے بعد حضور نظام کی رباعیاں اور سلام پڑھا تھا۔ وہ یہ ہے

رباعی

رفعت سے کیا نام مجھ کو رفعت نے دیے
کیوں ہو نہ رشید اپنی توقیر پہ ناز

پیغام نام مجھ کو عزت نے دیے
پڑھنے کو سلام مجھ کو حضرت نے دیے

ایک دوسری مجلس میں کلام فصاحت نظام کے پہلے رشید نے یہ رباعی پڑھی

رباعی

[illegible]
[illegible]

یہ نظم اچھی نظر سے دیکھی جائے
بعد اُس کے تلاوت اس کی بھی کیجیے

کئی رباعیاں حضور نظام نے ستائش رشید میں نظم فرمائی تھیں۔ اور پڑھنے کا حکم ہوا تھا۔ لہٰذا رشید نے جب اُن کو پڑھا۔ ہر ایک کے جواب میں ایک رباعی مدح [illegible] کہ رباعی میں رباعی کا جواب مدح نظام دونوں چیزیں موجود ہیں۔ مثلاً

مداح امام دو جہاں ہیں یہ رشید
پیری میں نیا رنگ سخن کا دیکھا

لاریب کہ اعجاز بیاں ہیں یہ رشید
میں کیا کہوں واللہ جواں ہیں یہ رشید

(۱) رشید (در جواب)

پیری میں جواں بنکے دکھیوں گا میں | اک جامہ نیا پہن کے دکھیوں گا میں

حضرت نے جواں کہا سنا تو نے فلک | ہر بار اب تجھ کو تن کے دکھیوں گا میں

شاید دوسرا مصرعہ علاوہ دیگر محاسن کے خلعت کے حسن طلب میں ہے اسی سال حضور نے خلعت مرحمت فرمایا تھا۔ ذیل کی رباعی بھی اسی مضمون کی تائید کرتی ہے۔

رشید

ہر اک باضطراب ادھر آتا ہے | گرمی میں ماہتاب ادھر آتا ہے

سلطان دکن سے مانگتا ہے خلعت | جاڑے میں آفتاب ادھر آتا ہے

(۲) آصف

گو پیر ہیں پر طبع کی جودت دیکھو | ہر شعر میں ہر بات میں جدت دیکھو

کہتے ہیں یہ آصف سے مضامین رشید | پیری میں جوانی کی طبیعت دیکھو

(۱) رشید

حضرت کی یہ اعجاز بیانی دیکھی | پیری کی نہ ذرہ بھی نشانی دیکھی

آداب بجا لاتے ہی تھا رنگ کچھ اور | جھک کر جو اٹھا میں تو جوانی دیکھی

(۳) آصف

کیا خوب سخن تم نے سنایا ہے رشید | مضمون کا اک باغ لگایا ہے رشید

پیری میں یہ زور طبع ماشاءاللہ | کیا رنگ جوانی کا دکھایا ہے رشید

ممکن ہے کہ کسی مرثیہ کی بہار بہت پسند خاطر ہوئی ہو اور اس کی داد میں یہ رباعی ارشاد فرمائی ہو۔

(۳) رشید

قابو میں کبھی نہ لا سکے گی مجھ کو | ڈھونڈھے گی مگر نہ پا سکے گی مجھ کو

اعلیحضرت نے سرفرازی بخشی | پیری اب کیا جھکا سکے گی مجھ کو

اس رباعی کی روانی اور تیور دیکھنے کے قابل ہیں جن طبیعتوں میں مذاق سخن خداداد ہے وہ اس کے مزے خوب لیں گے

ذیل کا سلام حضور نظام کے ان سلاموں میں سے ہے جو رشید کو مرحمت ہوئے تھے۔

آصف۔ سلام

سلامی دیکھنا اشکوں کے گوہر ایسے لٹتے ہیں | لیے ہیں شہ نے دامن میں مقدر ایسے لٹتے ہیں

مضامین غم سرور ذرا دل تھام کر سنیے | رگ جاں کھول دیتے ہیں یہ نشتر ایسے چلتے ہیں

سنا شبیر کا ماتم اور اک بجلی گری دل پر ۔ جو دل میں درد رکھتے ہیں وہ مضطر ایسے ہوتے ہیں

فرشتوں نے کہا جب سر کٹاتے آپ کو دیکھا ۔ ولی اللہ کے اللہ اکبر ایسے ہوتے ہیں

کھڑے عباس کے لاشے پہ یوں شبیر کہتے ہیں ۔ برادر پر ہوئے قرباں برادر ایسے ہوتے ہیں

لڑے اس ڈھنگ سے اکبر کہ دشمن بھی پکار اُٹھے ۔ بہادر ان کو کہتے ہیں دلاور ایسے ہوتے ہیں

زمیں سے عرش پر پہنچا دیا شبیر نے حُر کو ۔ خدا کے خاص بندے بندہ پرور ایسے ہوتے ہیں

غضب کا معرکہ تھا معرکہ عشقِ حقیقی کا ۔ کیا سر آپ نے سر دے کے سرور ایسے ہوتے ہیں

مرے آئینۂ دل میں ہے جلوہ ماہِ زہرا کا ۔ سکندر سے کہو دیکھے سکندر ایسے ہوتے ہیں

تنِ سرور پہ جتنے زخم تھے وہ سب بتاتے تھے ۔ چھری۔ تلوار۔ برچھی۔ تیر۔ خنجر ایسے ہوتے ہیں

محبت زینب و شبیر کی دیکھو تو ظاہر ہو ۔ کہ خواہر ایسی ہوتی ہے برادر ایسے ہوتے ہیں

لب و دندانِ شہ سے اور ہی کچھ بات پیدا ہے ۔ نہ لعل اس رنگ کے دیکھے نہ گوہر ایسے ہوتے ہیں

لڑے بچے جو زینب کے تعجب اس پہ بیجا ہے ۔ کہ جو شیروں میں پلتے ہیں وہ اکثر ایسے ہوتے ہیں

نہائے خون میں اصغر تو بانو سے کہا شہ نے ۔ کہ دیکھو باغِ جنت کے گلِ تر ایسے ہوتے ہیں

عدو بھی رہ گئے حیراں جو دیکھا صبر حضرت کا ۔ یہ کیا معلوم تھا سبطِ پیمبر ایسے ہوتے ہیں

جو تڑپے خون میں اکبر تو زینب نے کہا رو کر ۔ کہ دریائے شہادت کے شناور ایسے ہوتے ہیں

مظالم کربلا کے سن کے حیرت اس پہ ہوتی ہے ۔ کہ یہ مٹی کے پتلے دل کے پتھر ایسے ہوتے ہیں

زمیں بولی فلک سے دیکھنا زہرا کے پیاروں کو ۔ جو دن کو بھی چمکتے ہیں وہ اختر ایسے ہوتے ہیں

جو پوچھا تیغِ قاتل نے کہ عاشق کیسے ہوتے ہیں ۔ تو شہ بولے گلے اُس کو لگا کر ایسے ہوتے ہیں

پھڑک کر شہ کی شہ رگ کہہ رہی تھی اپنے قاتل سے ۔ کہ پیاسوں کے گلے مشتاقِ خنجر ایسے ہوتے ہیں

مزا کیا دے رہے ہیں یہ ترانے اپنے اے آصف ۔ یہ ہم نے آج جانا جامِ کوثر ایسے ہوتے ہیں

انعقاد مجالس مزید

اوپر ذکر کی ہوئی چودہ مجلسیں نواب بہرام الدولہ بہادر کی مقررہ دس مجلسوں کے علاوہ حضور نظام کے حکم سے قائم کی گئی تھیں۔ ان مجالس کے برپا ہونے کا خاص سبب ظاہر ہے وہ یہ کہ رشید کے کمال نے حضور نظام کے اشتیاق کلام کو روز بروز ترقی دینی شروع کی۔ جس قدر زیادہ سُنتے گئے اُسی قدر زیادہ محظوظ ہوتے گئے جب دس مجلسوں میں شاہ کی سُن کے سیری نہوئی تو نواب بہرام الدولہ بہادر کو حکم ہوا کہ پانچ مجلسیں اور کی جائیں۔ ما بدولت شرکت کرینگے۔ چنانچہ تعمیل حکم کی گئی۔ پانچویں مجلس میں پھر ارشاد فرمایا کہ اور چند مجلسیں ہوں۔ مجلسیں ہونے لگیں اور رشید کے جوہر کھلنے لگے۔

جناب رشید کے پیہم روز ایک مجلس پڑھتی گئی اور حضور نظام شرکت فرماتے رہے۔ یہاں تک کہ جب تیرھویں مجلس کی نوبت پہنچی تو نواب بہرام الدولہ بہادر سے ارشاد ہوا: "کہاں تک مجلسیں بڑھائی جائیں گی اب کل آخری مجلس ہو"۔

چودھویں مجلس میں حضور نظام جب تشریف لائے تو رشید کو اپنی ایک رباعی پڑھنے کو عنایت کی جو مضمون رخصت پر مشتمل ہے۔

آصف — عشقِ شہِ دیں کا یہ اثر پاتا ہوں | ہر روز جو میں جاتا ہوں پھر آتا ہوں
منظور الٰہی ہے تو پھر آؤں گا | یا حافظ و ناصر میں کہے جاتا ہوں

جناب رشید کی برق مثال فکر نے بھی فوراً ذیل کی رباعی اُسی ردیف و قافیہ میں موزوں کی اور اُس کے بعد پڑھی۔

رشید — پیری سے ضعف کو بہت پاتا ہوں | پھر فصلِ عزا آئے کہ پھر آتا ہوں
حافظ ہے وہ حضرت کو اُسی سے لونگا | میں جس کی حفاظت میں دیے جاتا ہوں

اب مجلسیں ختم ہوئیں اور جناب رشید علیہ الرحمہ رقم مقررہ کے عطیہ خزانہ شاہی سے بھی بہرہ

ہوئے۔ تعجب ہوتا ہے کہ مابین حضور نظام و رشید تعلقات سخن گوئی اس حد تک پہنچ چکے تھے۔ اور مراحم خسروانہ کی ابتدا ہو چکی تھی۔ مگر پھر بھی رشید کی قسمت نے کوتاہی کی۔ کہ نسلاً بعد نسل کوئی انتظام فارغ البالی نہ ہوا۔ ہاں۔ ایک سال قبل انتقال اعلیٰحضرت نے رشید سے فرمایا تھا: "آپ کے لیے انشاءاللہ میں کچھ سامان کر دوں گا" مگر افسوس ہے کہ رشید کی قسمت نے یاوری نہ کی یعنی آنجہانی حضور نظام کی زندگی نے وفا نہ کی۔

[illegible] | جناب رشید کو اُن کا کمال اور ضرورت ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں لیے لیے پھری۔ سنہ [illegible] میں نواب نصیر الممالک مرزا شجاعت علی خاں بہادر عازم کے یہاں تشریف لے گئے۔ اول دو تین سال تک نواب صاحب موصوف اور جناب رشید سے سلسلۂ خط و کتابت جاری رہا۔ اسی اثناء میں حکیم صادق حسین صاحب خلف حکیم حیدر حسین صاحب سے اس معاملہ میں گفتگو رہی۔ مگر رشید کی خودداری نے اُن کو اجازت نہ دی۔ مایحتاج سے کچھ زیادہ اُن کو حیدرآباد سے مل جاتا تھا۔ پھر کیا ضرورت تھی کہ ہوس مزید سے اپنے دامنِ کمال کو آلودہ کرتے۔ چونکہ جناب نواب صاحب خود وسیع النظر اور کمال شناس افراد میں سے ہیں۔ اس وجہ سے جب جناب رشید نے معمولی تحریک سے اُن کے یہاں جانے سے پہلوتہی کی تو نواب صاحب نے بھی یہ مرحلہ وقت ملاقات تک ملتوی رکھا۔ چنانچہ جب غالباً سنہ [illegible] میں اجلاس شیعہ کانفرنس کی شرکت کے لیے جو لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا۔ تشریف لائے تو جناب رشید سے ملنے گئے فرمایا: "میں اب آپ سے زبانی وعدہ لیتا ہوں" رشید نے وعدہ کر لیا۔ اور اسی سال سے ماہ ربیع الاول میں تشریف لے جانے لگے۔

کلکتہ میں مجلسیں پہلی ربیع الاوّل سے شروع ہوتی تھیں۔ اور دسویں کو ختم ہوتی تھیں۔ جناب رشید آٹھویں روز قیام فرماتے تھے۔ خواجہ عشرت نے لکھا ہو کہ عشرہ پڑھتے تھے مگر نہیں۔ جناب رشید نے ایک مجلس پہلی سال جناب نواب صاحب کی کوٹھی میں پڑھی جو کلکتہ میں ہو اور سفارت خانہ کے نام سے موسوم ہو۔ اُس کے بعد سے سفارت خانہ میں دو مجلسیں پڑھا کرتے تھے۔ اور ایک مجلس امام باڑہ فردوس محل واقع مٹیا برج میں اور بس۔ جناب نواب صاحب رشید کو تین سو پچاس روپیہ مرحمت فرماتے تھے۔

جناب رشید حالانکہ برابر حیدرآباد اور کلکتہ جاتے رہے۔ مگر یہ بات حیرت انگیز ہو کہ نہ تو انھوں نے خاص طور سے حیدرآباد کی سیر کی نہ کلکتہ کی۔ لوگوں نے اکثر کہا بھی مگر جواب دیا "میں ضعیف ہوا سیر و تفریح تو جوانوں کو زیبا ہو"

خدائے سخن میر علیہ الرحمہ کا بھی ایک واقعہ "آبِ حیات" میں یوں بیان کیا گیا ہو کہ اُن کو لکھنؤ کے ایک مرتبہ شناس نواب اُن کی تکلیف دیکھ کر مع اہل و عیال اپنے مکان پر لے گئے اور محل سرا کے پاس ایک معقول مکان رہنے کو دیا۔ نشست کے کمرہ کی کھڑکیوں کا رخ باغ کی طرف تھا۔ میر صاحب جب وہاں تشریف لے گئے تو کھڑکیاں بند پڑی تھیں اور اُسی طرح کئی برس اُن کی موجودگی میں بھی بند پڑی رہیں۔ اُن کو کھول کر کبھی باغ کی طرف نہ دیکھا۔ ایک دن کوئی دوست آئے۔ اُنھوں نے کہا کہ اُدھر باغ ہو آپ کھڑکیاں کھول کر کیوں نہیں بیٹھتے۔ میر صاحب بولے۔ کیا اُدھر باغ بھی ہو۔ اُنھوں نے کہا۔ اسی لیے نواب صاحب آپ کو یہاں لائے تھے کہ آپ کا جی بہلتا رہے اور دل شگفتہ ہو۔ میر صاحب کے سامنے پھٹے پُرانے مسودے غزلوں کے پڑے تھے اُن کی طرف اشارہ کرکے کہا "میں تو اس باغ کی فکر میں ایسا لگا ہوں کہ اُس باغ کی خبر ہی نہیں"۔

مرزا غالب اور کلکتہ کے نظر فریب مناظر

فطرتی مناظر کا حظ یورپ کے شعرا نے جیسا اٹھایا ہے مشرقی حصوں کے شعرا نے ویسا نہیں اٹھایا۔ اور اگر اس سے فائدہ اٹھایا بھی تو ایسے ہی شعرا نے جن میں فطرت نے نظارے سے اثر لینے کی قوت پیدا کر دی تھی +

جس کلکتہ کی سیر رشید نے نہیں کی اسی کلکتہ کو ہمارا ذکی الحس مست خیال شاعر غالب دہلی میں بیٹھا ہوا یوں یاد کرتا ہے +

قطعہ

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہمنشیں	اک تیر میرے سینہ میں مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب	وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ اُن کی نگاہیں کہ حف نظر	طاقت ربا وہ اُن کا اشارا کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ واہ	وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

وہاں کی مغربی طرز کی آبادی۔ جا بجا پائیں باغ۔ ولائتی جنگلے اور اُس کی سرِ شام فٹنوں سواری حسینانِ پارسی و فرنگ کی آزاد ہوا خوری۔ ان سب کے اثر سے غالب ایسا دل و نظر رکھنے والا کہاں تک بچتا + بالآخر کسی وقت کیفِ شراب میں گنگنا اٹھا۔ کہ ؎

وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

حقیقت تو یہ ہے کہ مصرعۂ آخر کا تابع تمام قطعہ ہے۔ پرتگال اور فرانس سے چلی ہوئی پہلے مدراس بمبئی کلکتہ کے بندرگاہوں پر کھلتی ہے اور وہاں کے قدح نوشوں ہی تک اُسے دَور چلتے ہیں +

رشید کو اُس سے کیا علاقہ تھا۔ اُن کے دماغ کو تو منہا نہ جنت۔ ساقی بہشت ساغرِ کوثر۔ حورانِ خوش منظر سب کے سب اپنی طرف اس قدر متوجہ رکھتے تھے کہ اگر ایک

جنت شدّاد کا سماں بھی سامنے سے گذر جاتا تو اُن کا خیال نہ بہکتا۔ چنانچہ ایک مرثیہ میں نجف سے مخاطب ہو کے کہتے ہیں ؎

مئے بخشش سے بھلا کب مجھے مایوسی ہے　　جس سے ملتا ہے خدا تیری محبت ہے وہ مے
نشہ بڑھتا ہے اسی کا ہوں میں ہر دم پیے　　مئے اُلفت کے تصور میں سراپا ہوں مَے

کب میں ناکام رہا رو نہ مرا کام بنا
دل اگر بیٹھ گیا ذرّہ تہِ جام بنا

کلکتہ میں بھی جناب رشید کے احباب ایسے ہی کمال شناس اور ذوی رتبہ تھے جیسے حیدرآباد وغیرہا میں۔ مگر اُن سبھوں میں جناب سید حسین صاحب شوستری رئیس کلکتہ کو جناب رشید سے بے حد حُسنِ عقیدت تھا۔ جب جناب رشید کلکتہ پہنچتے تھے حتی الوسع سید صاحب موصوف سے جلد سے جلد ملنے کی کوشش کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جناب رشید سید صاحب سے ملنے گئے۔ اثنائے گفتگو میں چاء اور الائچیوں کا ذکر آگیا۔ کسی صاحب نے کہا "بروک بونڈ" اچھی ہوتی ہے۔ کوئی بولا لپٹن کم خرچ بالانشیں ہے۔ غرضکہ حاضرین نے اپنی مختلف رایوں کا اظہار کیا۔ اب جناب رشید کی باری آئی تو فرمایا "جو زیادہ رنگین ہو وہی عمدہ"۔ سید صاحب چونکہ حُسنِ عقیدت رکھتے تھے سمجھے کہ رشید کو چاء اور الائچیاں مرغوب ہیں۔ لہٰذا جب رشید لکھنؤ واپس آئے تو چند دنوں کے بعد سید صاحب نے الائچیاں اور چاء تحفۃً رشید کو روانہ کیں۔ رشید مرحوم نے رباعیاں بطور شکریہ لکھ بھیجیں وہ یہ ہیں

ہر چیز کہ بھیجا تھا جو تحفہ پہنچا　　گردوں سے زمین پر من و سلویٰ پہنچا
اس کا عوض تو ہے دعا دوں میں رشید　　مجھ کو مرے دوست کا عطیہ پہنچا

الائچیوں کا شکریہ	جو دانہ ہے مشک کی طرح بے شک ہے ہر ایک الائچی ہے ایسا غنچہ	تخم اُلفت سمجھ لے گر زیرک ہے جس کی خوشبو دماغ سے دل تک ہے
چائے کا شکریہ	آنے پہ شکریہ کو تیار ہوں میں اس چاء میں کیف ہے مئے اُلفت کا	ضعف پیری جو ہے تو ناچار ہوں کیا ساقی سید حسین میخوار ہوں میں

پہلی اور تیسری رباعی بالکل صاف ہیں۔ مگر دوسری رباعی بہت خوب کہی ہے۔ الائچی کے دانہ کا تخم اُلفت سے ایسا استعارہ کیا ہے کہ سبحان اللہ۔ اور پھر زیرک بھی بہت خوب ہے +

رشید کانپور اور سلیم پور میں

جب جناب رشید نے لکھنؤ میں ترک مرثیہ خوانی کا اعلان کر دیا۔ تو اُن کے کلام کے سچے دلدادہ شکستہ خاطر ہوئے۔ اور دعائیں مانگتے تھے کہ رشید کسی طرح پڑھیں اور وہ سنیں۔ جب اُنھوں نے دیکھا کہ ہر قسم کی کوشش جناب رشید کے لکھنؤ میں پڑھوانے کے لیے ناکامیاب ہے۔ تو یہ عزم کیا کہ اگر رشید لکھنؤ کے اطراف میں بھی پڑھینگے تو سننے جائیں گے۔ چنانچہ ایک شخص میر کاظم حسین صاحب نے کوشش کی اور وعدہ لیا۔ کہ وہ ماہ صفر میں ایک مجلس کانپور میں پڑھیں۔ چنانچہ رشید حسب وعدہ ہر سال وہاں گئے۔ یہ مجلس بڑے امام باڑہ واقع محلہ بکاپور میں ہوتی تھی۔ علاوہ اطراف کے مؤمنین کے لکھنؤ سے تقریباً دو ڈھائی سو آدمی جایا کرتے تھے! اور مجلس ایک بڑے مجمع سے ہوتی تھی +

جناب راجہ صاحب سلیم پور کے یہاں بھی ایک مجلس اسی زمانہ میں پڑھتے تھے۔ بروز مجلس صبح کو راجہ صاحب کا موٹر آ جاتا تھا رشید چلے جاتے تھے۔ اور بعد ختم مجلس واپس آتے تھے راجہ صاحب ایک معقول رقم دیتے تھے +

ایک مرتبہ ۱۳۱۱ھ میں جناب خان بہادر سید محمد ہادی صاحب ہادی ڈپٹی کمشنر جناب رشید کی ملاقات کے لیے رکاب گنج تشریف لائے۔ سید صاحب موصوف نے

چند رباعیاں جناب رشید کو سنائیں۔ بہت خوش ہوئے۔ تحسینِ کلام ان الفاظ میں فرمائی: "آپ کا رنگِ سخن بالکل نیا ہے۔ اور زبان بھی بہت خوب ہے" جناب سید صاحب جعفر منزل (قیصر باغ) میں مقیم تھے۔ دوسرے روز جناب رشید بازدید کی غرض سے تشریف لائے۔ جناب سید صاحب نے چاہا کہ وہ ایک مجلس لکھنؤ میں منعقد کریں اور جناب رشید رونق افروز ممبر ہوں۔ مگر چونکہ جناب رشید نے لکھنؤ میں مرثیہ پڑھنا ترک کر دیا تھا۔ اس وجہ سے مجلس نہ ہوئی۔ جناب سید صاحب نے اپنے دولت خانہ پر (سلطان پور میں) ایک مجلس کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اور جناب رشید سے وعدہ لیا۔ مگر یہ مجلس بوجہ علالت جناب سید صاحب عرصہ تک نہ ہو سکی۔ اور جناب رشید راہی عدم ہوئے۔ چند رباعیاں جو جناب ہادی صاحب نے جناب رشید مغفور کو سنائی تھیں ازراہِ کرم مجھ کو عنایت فرمائی ہیں۔ ذیل میں درج کرتا ہوں +

رباعیات

ہادی ہو تو اور کسی خطا سے نہ ڈرے اس نازشِ حبِ مرتضیٰ سے ڈرے	حیرت ہے کہ نار سے بھی یا سے نہ ڈرے ایسا تو نہ ہو کہیں خدا سے نہ ڈرے
کیونکر کوئی امتی نبی سے نہ ڈرے یہ دونو خدا سے ہیں ڈرانے والے	مومن کیسا اگر علی سے نہ ڈرے جو ان سے ڈرے وہ پھر کسی سے نہ ڈرے
دنیا کی ہوس میں دین کی بربادی واہ روزے غائب نماز گاہے گاہے	تو اور یہ لاف واہ اے ہادی واہ مولا کا غلام اور یہ آزادی واہ
سرمست ولائے نبی کی صحبت والے بوذر، مقداد، ابنِ یاسر، سلمان	تھے زندگی بڑی محبت والے اس بزم کے چھٹتے ہوئے متوالے

ہادی یہ نصیریوں کی ملت والے لیکن اُن کا مذاق تھا غیر سلیم	تھے رند اسی نشۂ اُلفت والے اتنی پی لی کہ ہو گئے متوالے
موتی سے گئے وہ دانت ہیہات کہاں ہادی بنوا کے دانت کیا کام بنا	اب لہجہ و لب میں وہ مساوات کہاں گو بات نکلتی ہے یہ وہ بات کہاں

تلامذۂ جناب رشید یوں تو جناب رشید کے شاگردوں کی اگر فہرست لکھی جائے تو طویل ہوگی۔ مگر یہ چند حضرات قابل ذکر ہیں۔ نواب تراب علی خاں صاحب سعید۔ نواب خان خاناں بہادر۔ جناب سید باقر صاحب حمید۔ جدید سید عسکری مرزا صاحب موؔدب سجاد حسین صاحب شدید۔ مہدی حسن صاحب ناصری پروفیسر احمد حسین عرف منھو صاحب شفیق (صاحب دیوان) ابو صاحب جلیس۔ حقیر مؤلف۔ نواب بڈھن صاحب فرہاد سید مہدی حسین صاحب مہدی۔ سید انور حسین صاحب آنور۔ احمد خاں صاحب نظم منشی حامد حسین صاحب حامد +

واقعات آخر عمر جیسا اوپر بیان ہوا۔ رشید نے لکھنؤ میں مرثیہ پڑھنا ترک کر دیا تھا۔ قاعدہ ہے کہ جب کسی فن کے کرنے والے اپنی زندگی کے آخری کنارہ پر پہنچنے لگتے ہیں۔ تو زمانہ دوسرے افراد اُن کی قائم مقامی کے لیے تیار کرنے کا عمل شروع کر دیتا ہے۔ چنانچہ رشید۔ عارف اوج۔ جاوید کے بعد مرثیہ گوئی کے قیام کے لیے چند نوخیز خاندانی مرثیہ گو میدان امتحان میں خم ٹھوک کر آ کھڑے ہوئے اور بمقاد کُلُّ جَدِیْدٍ لَذِیْذٌ۔ عوام نے بھی اُن کی طرف غیر معمولی دلچسپیوں کا اظہار کیا۔ اور جانبداری میں اس قدر افراط و تفریط سے کام لیا کہ پرانے نفوس گوشہ گیر ہو گئے۔ اگر مرثیہ گوئی اُن کا ذریعہ معاش نہ ہوتا تو غالباً سب کے سب گوشہ گیر ہو گئے ہوتے۔ اور پھر کوئی اُن کی صورت نہ دیکھتا۔ کنج عزلت و قناعت

کی لذت جن کو حاصل ہو وہ اسے ایک نعمتِ عظمیٰ سمجھتے ہیں۔ ہر وقت میں رشید اس نعمت سے متنعم رہے اور نہایت خوبی سے نباہا +

جناب رشید نے اپنے کلام میں پیری کو اس قدر آوازیں دی تھیں کہ وہ اُن کے پاس عین وقت پر آپہنچی تھی۔ اعضا جواب دے چکے تھے۔ جب کوئی ملنے جاتا تھا تو فرماتے تھے "ہم گھٹ رہے ہیں اور ناتوانی بڑھ رہی ہے"۔ جن لوگوں نے اُن کو قوی و تندرست دیکھا تھا۔ یہ حالت دیکھ کر اکثر آبدیدہ ہو جاتے تھے +

صورت یہ تھی کہ پچھتر ۷۵ برس کا سن۔ وہ کمر جس میں کبھی تلوار بندھتی تھی پیرانہ سالی سے جھکی ہوئی۔ وہ آنکھیں جنھوں نے ایک عمر دُنیا کی مختلف نمائشوں کی سیر کی ضعفِ بصر کی شاکی۔ وہ ہاتھ جنھوں نے زلفِ پریشانِ سخن آراستہ کی ضعف سے مرتعش۔ وہ سر جس کے مختلف گوشے کبھی شاعرانہ نازک خیالیوں سے مملو تھے معمولی مسافت سے بیکار۔ وہ زبان جو زبانِ انیس کی ترجمان تھی دُنیائے سخن کی ناگوار شورش سے خاموش۔ مگر رشید اب بھی وہی رشید تھے۔ اگر کوئی وقتِ آزمائش آپڑتا تو اُن کی قوتِ شاعرانہ اُسی طرح کام کرتی جیسے تیس برس قبل +

چنانچہ ایک مرتبہ مکان سے اپنے چھوٹے بھائی جناب کلن صاحب کے یہاں جا رہے تھے۔ مسافت سو قدم سے زیادہ ہوگی کہ لڑکھڑا کر گر پڑے۔ اتفاق سے اسی وقت کچھ حضرات ملنے آرہے تھے اُنھوں نے جلدی سے اُٹھایا۔ رشید نے فوراً شکایتِ ضعف میں یہ شعر پڑھا ؎

ضعف نے اوج بڑھایا ہے یہ قہالی کا
پاؤں کرتے ہیں ارادہ مری پامالی کا

اس واقعہ کے تیسرے روز سے ایسے صاحب فراش ہوئے کہ پھر نہ اُٹھے۔

وفات و دفن — اس سے پہلے لکھ چکا ہوں کہ رشید بہت کمزور ہو گئے تھے۔ اُن کی گفتگو سے مترشح ہوتا تھا کہ موت کا شدید انتظار کر رہے ہیں۔ جو ملنے جاتا تھا اُس سے ایسی مایوسانہ تقریر کرتے تھے کہ کچھ نہ کچھ اثر لے کے اُٹھتا تھا۔ کہ یکایک شب پنجشنبہ چودہ ذیقعدہ ۱۳۳۶ھ ہجری کو تنِ لاغر پر فالج گر کے خبر دی کہ اب ادبی دُنیا پر رشید کا احسان ختم ہوتا ہے۔ زبانِ انیس خاموش ہوتی ہے۔ وہ وجود جو پُرانے اوضاع و اطوار کا آخری نمونہ تھا۔ راہِ فناطے کر کے ملکِ بقا آباد کرنے والا ہے۔ صبح ہوتے ہوتے رشید کی علالت کی خبر تمام شہر میں مشتہر ہو گئی۔ اعزا و احباب اس وجودِ مغتنم کی عیادت کو جوق جوق آنے لگے۔ رشید بے حس و حرکت پڑے تھے۔ ادائے شکریہ کا زبان کو یارا نہ تھا۔ جو شخص سامنے آتا تھا۔ سلام کو پہلے ہاتھ اُٹھا دیتے تھے۔ روزِ علالت سے چودہ دن تک اسی حالت میں رہے۔ شہر کے ممتاز اطبا مثلاً جناب حکیم مُنے آغا صاحب فاضل۔ جناب حکیم سید مظفر حسین صاحب طبیب جناب حکیم سید امیر حسین صاحب مرحوم۔ جناب حکیم جعفر حسین صاحب وغیرہم یک رائے ہو کر مصروف تدبیر تھے لیکن موت کا کیا علاج۔ آخر کار چوہتر برس کی عمر کے بعد بروز چہارشنبہ ۲۶ ذیقعدہ ۱۳۳۶ھ ہجری وقت سحر اس دُنیا کے تماشہ گاہ کو خیرباد کہہ کے ملکِ بقا میں روحانی زندگی کی ابتدا کی۔ اعزا و احباب کو اپنی یاد کا غم دے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

صبح کو ہزاروں آدمیوں سے میر عشق کی بغیہ بھری ہوئی تھی۔ لکھنؤ کے ہر طبقہ کے لوگ شرکت تجہیز و تکفین کا آخری احسان رشید کی روح پر کرنے کو

بیٹھے تھے کہ نمازِ میت کے لیے صفیں مرتب ہوئیں۔ رشید کے محترم دوست جناب مولوی محمد سید حسین صاحب قبلہ علامۂ ہندی مرحوم نے نمازِ میت پڑھائی۔ چاروں طرف سے آوازِ بکا بلند تھی۔ لکھنؤ کی وہ مشتِ خاک جو خونِ شرافت اور جوہرِ کمال سے خمیر ہوئی تھی مہرِ زیرِ زمیں نہاں ہونے والی تھی۔ اعزا الگ گریاں تھے احباب الگ خروشاں۔ علما الگ آبدیدہ۔ چنانچہ افقہ زماں مولانا سید باقر صاحب قبلہ مجتہد العصر نے جناب حمید مرحوم سے دردآمیز لہجہ میں فرمایا "آج ہم میں سے ایک صاحبِ کمال اُٹھ گیا" اُن کے علاوہ اور دوسرے مجتہدین اولو العزم مثلاً شمس العلما جناب مولانا سید ناصر حسین صاحب قبلہ۔ شمس العلما جناب مولانا سید نجم الحسن صاحب قبلہ۔ زبدۃ العلما جناب سید آقا حسن صاحب قبلہ۔ جناب مولانا سید سبطِ حسن صاحب قبلہ۔ جناب مولانا سید محمد رضا صاحب قبلہ مرحوم اعزا کو تلقینِ صبر فرما رہے تھے +

چونکہ امام باڑہ کے اُس حجرہ میں جہاں نعشؔ و صابرؔ وغیرہم مدفون ہیں بالکل جگہ نہ تھی۔ اس لیے اُس دالان میں جو زیرِ مسجد ہے مدفون ہوئے + جمعہ کو مجلس فاتحہ خوانی ہوئی۔ اور بائیس ذی الحجہ بروز یکشنبہ امام باڑہ جناب سید تقی صاحب اعلی اللہ مقامہٗ میں مجلس چہلم ہوئی۔ اور متعدد قطعات تاریخ پڑھے گئے۔ جن میں سے اختصاراً چند درج کیے جاتے ہیں +

منظومہ مداحِ آلِ محمد جناب مرزا کاظم حسین صاحب محشرؔ لکھنوی	
ہزار حیف جہاں سے اُٹھے جنابِ رشید	ریاضِ مدح میں اک حشر ہو گیا برپا

زبانِ اہلِ سخن پر یہ نوحۂ غم ہے — اُنھیں کا دم تھا کمالاتِ فن کو وجہِ بقا
گئے عدم کو جو وہ زیبِ ممبرِ مجلس — جناں میں پائی جگہ نزدِ سید الشہدا
نکات نظم پہ قادر طبیعت فطری — زباں سے شعر جو نکلا وہ بیعدیل ہوا
رباعیات میں پیری کی یوں کہے مضمو — جوانوں کے لیے اندازِ وعظ تھے گویا
بہار مرثیوں کی وہ بہارِ دلکش تھی — کہ جس پہ بلبلِ سدرہ بھی والہ و شیدا
زباں وہ صاف کہ مانند موجۂ کوثر — مزا تھا بزم میں جس سے علی کی مدحت کا
سنواری شوق میں جب زُلفِ شاہدِ اُردو — خود آئی قدرتِ تخئیل بن کے آئینا
دکھائی بزم میں جب قدرتِ بلاغت کی — دلِ عدو بھی تھا حُسنِ قبول کا شیدا
رشید مدح سرائی میں ایسے اکمل تھے — کلام جن کا سند اہلِ علم نے مانا
مریض ہو گئے یوں دفعتاً بڑھاپے میں — محال ہو گیا بارِ حیات کا اُٹھنا
محال ضعف سے فالج کے گو کہ جنبش تھی — مگر گئے سوئے اجداد جبکہ آئی قضا
سحر کا وقت تھا ذیقعدہ کی تھی بست و ششم — کہ آفتابِ کمالات زیرِ خاک چھپا
لحد ہی پڑھ کے احباب فاتحہ کے لیے — ہر ایک آنکھ سے جاری تھا اشکوں کا دریا
وہیں پہ قبر بنی جس جگہ پہ سوتے تھے — بس ایک ہی تھا حیات و وفات کا نقشا
شمیم قبر کے پھولوں کی دے رہی تھی خبر — وہ پہنچا مدح سرا سوئے جنت الماوا
سنِ وفات یہ محشر سے کہہ اُٹھا رضوا — ہر ایک بیت پہ اک پا کے گھر ارم میں ملا
۱۳۴۶ھ

منظومۂ جناب سید ظہور حسین صاحب فروغ سیتاپوری

جا بگزار ماتم پُر درد رشید بکیست — رفت زیں دار فنا کامل اعجاز بیاں
۱۹۱۸ع — ۱۳۲۵ف
ہائے رود! چنیں واقعہ صعب فروغ — واقفِ فنِ سخن حیف نماند بجہاں
سمت ۱۹۷۵ — ۱۳۳۶ھ

دوسرا سانحۂ جانگزا انتقال حمید۔

جناب رشید مرحوم کے بعد اس خاندان میں لوگوں کی نظریں اُن کے بھائی جناب سید باقر مرزا صاحب حمید پر پڑنے لگیں۔ یہ مرحوم بھی نہایت کُہنہ مشق اور خوش گو تھے۔ دُنیائے مرثیہ گوئی میں لوگ ان کو بھی نظرِ تحسین سے دیکھتے تھے۔ خصوصًا بعد وفات جناب رشید۔ مگر افسوس ہی کہ عالمِ پیری آپہنچا تھا ۱۴ ماہ صفر ۱۳۲۹ھ کو جناب حمید نے بھی بعارضۂ تپِ وبائی مبتلا ہو کر انتقال کیا۔ جناب حمید میں وہی پُرانی وضع کے جوہر پائے جاتے تھے۔ اخلاق نہایت وسیع تھے۔ گفتگو نہایت نرم اور شیریں۔ اعزّا و احباب سے ہمدردی کرتے تھے۔

اسی سال جناب نواب بہرام الدولہ بہادر نے اُنھیں حیدرآباد طلب فرمایا تھا۔ اور جناب رشید جن تاریخوں میں مجلسیں پڑھتے تھے اُن میں پڑھوایا تھا۔ مشہور ہی کہ حمید مغفور نے بھی جناب رشید کی طرح مقبولیت حاصل کی تھی۔ بعد ختم مجالس وہیں تپ میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اُسی حالت میں لکھنؤ واپس آئے اور چند روز کے بعد انتقال کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون +

اب رشید کے نواسے جناب میر سجاد حسین صاحب شدید بحمد اللہ موجود ہیں۔ جن سے اُن مرحوم کا نام روشن ہوسکتا ہی +